قصصِ ہند

(عہدِ اسلامی)

مولانا محمد حسین آزاد

کتب خانۂ
انجمنِ حمایتِ اسلام، برانڈرتھ روڈ، لاہور

قصصِ ہند

(عہدِ اسلامی)

مولانا محمد حسین آزاد

کتب خانہ انجمن حمایت اسلام. براندرتھ روڈ. لاہور

مطبوعہ۔ حمایت اسلام پریس۔ لاہور

طبع اوّل

تعداد ۱۰۰۰

اگست ۱۹۶۳ء

قیمت فی جلد تین روپے

ناشرین:۔ کتب خانہ انجمن حمایت اسلام۔ لاہور

فہرست مضامین

۱	غزنوی خاندان کی ابتدا	۱
۲	محمود غزنوی	۵
۳	شہاب الدین غوری	۱۳
۴	علاؤ الدین اور کولا دیوی	۱۹
۵	پدمنی	۲۱
۶	خضر خاں اور دیول دیوی	۲۵
۷	ظہیر الدین بابر بادشاہ	۲۹
۸	نصیر الدین ہمایوں	۴۱
۹	جلال الدین اکبر بادشاہ	۵۱
۱۰	اکبر کی یلغار احمد آباد گجرات پر	۵۴
۱۱	نور جہاں بیگم	۶۴
۱۲	شہاب الدین شاہجہان	۷۲
۱۳	محی الدین اورنگ زیب کی عالمگیری	۷۷
۱۴	عالمگیر کا لشکر دکن پر جاتا ہے	۸۴
۱۵	سیوا جی	۹۶
۱۶	محمد شاہ کی تمہید سلطنت	۱۰۷
۱۷	محمد شاہ کا زمانہ اور نادر شاہ کا آنا	۱۰۸
۱۸	بابا نانک صاحب	۱۱۹

قصصِ ہند

عہدِ اسلامی

غزنوی خاندان کی ابتدا

سلاطین سامانیہ جو تُوران اور ایران وغیرہ میں بڑے با اقتدار بادشاہ گزرے ہیں ان میں سے عبدالملک ابن نوح پانچویں بادشاہ کی خدمت میں الپتگین نام ایک غلام تھا کہ بادشاہ کو بھان متی کے تماشے دکھا کر اور نقلیں سنا کر خوش کیا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ مجلسِ عشرت سے نکل کر دربارِ سلطنت میں داخل ہوا اور پھر اپنی دانش و دانائی کی بدولت حاکمِ خراسان ہوگیا جب عبدالملک مرگیا تو اُمرائے دربار نے اسے بھی خط لکھا کہ تخت نشین کس کو کرنا چاہیے۔ اس تقدیر کے مارے نے منصور کے برخلاف رائے دی کہ وہ نوجوان یہاں تخت نشین ہوچکا تھا۔ منصور نے اس کا خط دیکھ کر بہت پیچ و تاب کھایا اور اس کے درپے ہوگیا۔ دشمن اس کی بھی تاک میں لگے ہی تھے۔ فوراً دربار میں طلب ہوئی۔ چنانچہ ایسے نازک وقت میں اگر جان نہ جاتی تو قید ہوجانے میں تو شبہ ہی نہ تھا۔ ناچار سپاہیانہ پیچ کھیلا۔ اس کے پاس خاصے کے غلاموں اور نوکروں کا جتھا خوب تھا انہی کی آڑ میں جان بچا کر مقام غزنی میں کہ بین کوہِ سلیمان کے بیچوں بیچ میں ہے جا پہنچا۔ غرض ادھر کے بہادر اور قوی ہیکل خود سروں کو سمیٹ کر دشمنوں کے قابو کا نہ رہا مگر پھر بھی اپنے آقا کے گھرانے کی اطاعت ہی کرتا رہا۔ تین ہزار غلام اس کے تن کا ہمراہ آیا تھا۔ اس کے علاوہ ادھر کے افغان اگمدول سے تابع نہ

ہوئے تو وقت پر نوکر ہو گئے۔ غرض اس قطعہ پر قابض ہو گیا کہ جس میں بلخ، ہرات، سیستان وغیرہ شامل ہیں۔ سبکتگین ایک فلک، زدہ ایران کے شاہی خاندان کا لڑکا تھا کہ الپتگین نے اسے ایک بخاری سوداگر سے خریدا تھا اور ایسے مرتبے پر پہنچایا تھا کہ بعد اس کے دربار میں رکن اعظم وہی ٹھیرا۔ چنانچہ الپتگین کے بعد جب اس کا بیٹا جانشین ہوا اور اطراف کے لوگوں نے زور دیا تو سبکتگین اسے بخارا سے حکومت کی سند دلوا کر لایا، جس میں نیابت سبکتگین کے نام پر تھی۔ دو برس کے بعد وہ بھی مر گیا اور ایک دو اُتار چڑھاؤ کے بعد جب اہل دربار نے ملک غیروں کے ہاتھ جاتا دیکھا تو بالاتفاق سبکتگین کی اطاعت پر رضامند ہو گئے۔ چونکہ صاحب ہمت اور باتدبیر شخص تھا، تخت پر بیٹھتے ہی ایک ہمسایہ کے حاکم نے اس سے مدد لیکر دشمن کے ہاتھ سے اپنا ملک بچایا، مگر احسان نہ مانا اس لئے ملک سبکتگین کے حوالے کرنا پڑا۔ سبکتگین نے الپتگین کی بیٹی سے شادی بھی کر لی اور یہیں سے ستارۂ اقبال کا طلوع شروع ہوا۔

پنجاب کی حد ان دنوں میں غزنی کی حد تک پھیلی ہوئی تھی، اور راجہ یہاں کا جے پال تھا۔ جب مسلمانوں کے قدم آگے بڑھتے معلوم ہوئے تو اس نے غزنی پر ایک بھاری فوج سے چڑھائی کی۔ چنانچہ دفعتہً لمغان پر جا کر ڈیرے ڈال دیئے اور پشاور سے کابل تک برابر لشکر پھیلا دیا۔ ادھر سے سبکتگین بھی نکلا چنانچہ دونوں فوجیں آمنے سامنے پڑی تھیں۔ ایک دوسرے کی پیش دستی کا منتظر تھا کہ دفعتاً آسمانی گولا پڑنے لگا یعنی بے موسم برف گرنی شروع ہو گئی۔ وہ لوگ تو برف کے کیڑے تھے، انہیں خبر بھی نہ ہوئی۔ ہندوستانی بیچارے اپنے لحاف اور رضائیاں ڈھونڈنے لگے مگر وہاں رضائی کا گزارہ کہاں۔ سینکڑوں اکڑ کر مر گئے۔ ہزاروں کے ہاتھ پاؤں رہ گئے، جو بچے ان کے اوسان جاتے رہے۔ گھروں میں جو کہانیاں سنا کرتے تھے کہ ان پہاڑوں میں ایک چشمہ ہے کہ جب اس میں کچھ ناپاک چیز ڈالتے ہیں تو اتنی برف پڑتی ہے کہ شہر کے شہر دب جاتے ہیں۔ جانا کہ یقیناً ان لوگوں نے ہمارے مارنے کے لئے کچھ ویسا ہی عمل کیا۔ بس اب گھر جانا اور گھر والوں کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔ راجہ جے پال نے جب ان پہاڑوں میں بارش کی ایسی شدت دیکھی اور سردی کے مارے فوج کو بے کار پایا تو پیغام صلح کا بھیجا۔ سبکتگین نے اسی وقت ارکان دولت کو جمع کر کے صلاح کی۔ سب نے صلح کو غنیمت جانا۔ مگر ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، محمود کہ نوجوانی کے زور میں بھرا ہوا تھا، اس نے نہ مانا اور راجہ کے وکیلوں کو ناکام پھیر دیا۔ راجہ سن کر بہت خفا ہوا اور پھر

دوبارہ کہلا بھیجا کہ معلوم ہوتا ہے ہمارے لشکر کے بھاری بھاری سامانوں کے لوٹنے کی طمع تم کو صلح نہیں کرنے دیتی۔ مگر یاد رکھنا ہم راجپوتوں کا قاعدہ ہے کہ جب ایسا موقع آپڑتا ہے تو اوّل تمام بال بچوں کو اپنے ہاتھ سے فنا کرتے ہیں۔ مال و دولت نقد و جنس کو جلا کر خاک کرتے ہیں۔ ہاتھی گھوڑوں اور مواشی کو اندھا کر دیتے ہیں۔ بعد اس کے آپس میں ایک دوسرے کے گلے مل تلواریں کھینچ دشمنوں پر جا پڑتے ہیں۔ پھر جو کرے سو خدا۔ اگر مار لیا تو دم کے ساتھ پھر سب کچھ موجود ہے اور جو مر گئے تو دنیا میں سرخ رو ہوئے عاقبت میں بہشت پائی اور خاکستر کے سوا دشمن کے ہاتھ خاک بھی نہ آئی۔ اس پیغام کو سُن کر محمود بھی خاموش ہو رہا اور سب نے کہا کہ جس جان کے لینے میں مال ہاتھ سے جائے اس جان کے لینے سے کیا حاصل۔ بہرحال صلح بہتر ہے کہ روپیہ آئے تو مسلمانوں کے کام آئے۔ جب سب کے اتفاقِ رائے سے صلح ٹھہر گئی تو راجہ نے اپنا ایک معتبر یہاں چھوڑا اور سبکتگین کے آدمی ساتھ لئے کہ اپنی تخت گاہ میں جا کر بموجب عہدنامہ کے ہاتھی گھوڑے مال دولت سب سپرد کر دے گا۔ مگر جب اپنے ملک میں پہنچ کر برف و باراں کی سردی اور تلوار کی آنچ سے خاطر جمع ہوئی تو دربار عام کیا۔ اس زمانے میں دستور تھا کہ داہنے ہاتھ پر دھرم کے مالک برہمن اور بائیں طرف صاحبِ شمشیر چھتریوں کے بڑے بڑے سردار کھڑے رہتے تھے۔ ان کی صلاح کے بموجب سلطنت کے کام طے ہوتے تھے۔ برہمنوں نے کہا کہ مہاراج اس طرح مسلمانوں کو خراج دینے میں حضور کی بدنامی اور بے عزتی ہے۔ آپ بادشاہ کے آدمیوں کو روک لیجئے اور کہہ دیجئے کہ جب تک ہمارا آدمی وہاں سے نہ آئے گا ہم ان آدمیوں کو نہ جانے دیں گے۔ مگر چھتریوں نے کہا کہ مرد کو بات کا پاس ضرور ہے دوست سے ہو یا دشمن سے۔ دوسرے ترکوں کی فوج جس کے سامنے سے ایک دفعہ فوج ہماری ہٹ آئی اب اس کے مقابلے پر تھمنا بہت مشکل ہوگا۔ اگر وہ لوگ ادھر چڑھ آئے تو تمام ہندوستان کو تہ و بالا کر دیں گے۔ پھر اس خلق خدا کا خون اور ننگ و ناموس کا گناہ کس پر ہوگا؟ غرض چھتریوں نے ہزار جتن سے جتایا، برہمنوں کے بچن کے آگے ان کی تلوار کاٹ نہ کر سکی۔ آخر وہی ہُوا کہ بادشاہی آدمیوں کو روک لیا۔ غزنی میں فوراً خبر اڑی کہ بادشاہ کے آدمی قید ہو گئے۔ مگر سبکتگین کو یقین نہ آیا اور کہا کہ یہ خبر ہوائی ہے لوگوں نے اڑائی ہے۔ جب تحریریں پہنچیں۔ اور تحقیق ہُوا تو اسی وقت ضلع ضلع سے فوجیں سمیٹ کر برستی گھٹا کی طرح شمال سے اٹھا اور آتے ہی سرحد کے

ملکوں پر آفت برسا دی۔ بہت سا مال و دولت لوٹا اور ہزاروں کو لونڈی غلام بنا لیا۔ راجہ کو جب یہ خبر پہنچی تو تمام ہندوستان میں چٹھیاں دوڑا دیں۔ خلاصہ ان کا یہ کہ دشمنوں کا بادشاہ اور ملیچھوں کا سلطان جنگل پہاڑ کے راچھسوں کی فوجیں لے کر چڑھ آیا ہے۔ پنجاب کا ملک قدیم الایام سے سب بھائی بندوں کی سپر بنا ہوا ہے۔ چنانچہ اگلے سال میں نے خود اس کے گھر پر جا کر ایک ٹکر کو روکا۔ مگر اب دھرم کی لاج رکھنے کا وقت ہے۔ نہیں تو اس سرے سے اس سرے تک تمام ہندوستان پر پانی پھر جائے گا۔ ان چٹھیوں نے بڑا کام کیا۔ یعنی علاوہ اور ملکوں کے دلی، اجمیر، قنوج، کالنجر کی عظیم الشان سلطنتوں نے اپنی اپنی انتخابی فوج بے تعداد خزانوں کے ساتھ بھیجی اور لڑائی کے وقت پر خود بھی آنے کا وعدہ کیا۔ سارے لشکروں کی چھاؤنی پشاور پر ہوئی۔ بادشاہ کو اس دھوم دھام کی خبریں ایک سے دہ چند ہو کر پہنچیں۔ گھبرایا نہ شیر کی طرح جھپٹ کر آیا۔ پاس پہنچا تو ایک پہاڑ کے ٹیکرے پر چڑھ کر نظر دوڑائی۔ جہاں تک آنکھ نے کام کیا فوج ہی فوج پائی۔ اترا اور اپنے سرداروں کو بلایا۔ ان کے بھی ہوش اڑے پائے۔ اول تو بہت سے مضمون ثواب جہاد اور تائید غیبی کے سنائے، پھر شجاعوں کی اولوالعزمیاں اور کارنامے کہہ کر دل بڑھائے۔ بعد اس کے کہا کہ دیر کا موقع نہیں، لڑائی شروع کر دینی چاہیے۔ لیکن چال نئی چلا۔ یعنی اگر آج کل کی جنگی قواعد پر نظر کریں تو موٹی سی بات ہے۔ مگر اس وقت کے نکتے ہیں۔ تھوڑی سی فوج نے دل بادل لشکر کو توڑ دیا۔ چنانچہ حکم دیا کہ پانچ پانچ سو سوار کا رسالہ ایک ایک سردار کے نیچے مقرر ہو۔ باری باری سے جائیں اور ہمت آزمائیں۔ جب وہ تھک جائیں تو ان کی جگہ اور تازہ دم جا کر مورچے جمائیں۔ اس ترکیب سے ہندو شام تک لڑتے لڑتے دق ہو گئے تو بھی لشکر کی بہتات سے دل قوی رکھتے تھے۔ سب نے جمع ہو کر ایک حملہ ایسا کیا جس میں لڑائی دو ٹوک ہو جائے۔ چنانچہ کیا سوار کیا پیادے، نرسنگے بجاتے اور کڑکے گاتے غول کے غول نکلے اور اس طرح بے جگر ہو کر گرے کہ تیر اور نیزے کا گزارہ نہ رہا۔ خنجر کا تلوار سے اور کھانڈے کا کٹار سے مقدمہ آ پڑا۔ پیادے پیادوں سے لپٹ گئے۔ سوار گھوڑوں سے کود کود پڑے۔ ہاتھیوں نے اپنا پرایا کچھ نہ دیکھا، سب کو چکی کی طرح دل ڈالا۔ مگر خدا کی خدائی ایسے وقت پر نظر آتی ہے۔ ہر بات میں اپنی قدرت کا دکھانا ہے، ہندو مسلمان کا بہانا ہے۔ آخر ہزاروں کا کھیت پڑا اور خاتمہ ہندوؤں کی شکست پر ہوا۔ فتح یاب لوٹتے مارتے اٹک تک آئے اور دو سو ہاتھی

اور لاکھوں کا زر و مال لے کر گھر کو چلے گئے۔ بادشاہ کی حکومت اس وقت غزنی سے قندھار کے آگے تک تھی۔ اس کی درستی میں جا کر مصروف ہوا۔ اور چند روز کے بعد ۹۹۷ء میں مر گیا
۳۸۷ھ

محمود غزنوی

محمود اور اسمٰعیل دو بیٹے سبکتگین کے تھے، مگر محمود کا لڑکپن سے یہ حال تھا کہ فوجکشی اور لڑائیوں میں باپ کے ساتھ ہی رہتا تھا بلکہ ہر مہم میں ایسا اپنی بساط سے بڑھ کر قدم مارتا تھا کہ تجربہ کار سپہ سالار دیکھتے رہ جاتے تھے۔ جب باپ مرا تو یہ نیشا پور میں حاکم تھا۔ تیس برس کی عمر بھی اور لیاقت، شجاعت کی رُو سے ہر طرح جانشینی کے قابل تھا۔ اتنی بات ضرور تھی کہ ماں کی طرف سے داغدار تھا۔ چھوٹے بیٹے کو باپ بہت چاہتا اور اپنے پاس ہی رکھتا تھا۔ اس نے جب باپ کے مرنے سے تخت کے ساتھ میدان خالی پایا تو فوراً تاج سر پر رکھا۔ جا بجا فرمان جاری کئے اور دربار میں امیروں وزیروں کے منصب فوج کی تنخواہیں بڑھا کر جشن شاہانہ شروع کر دیے تاکہ سب کے دل میں گھر ہو جائے اور دلاور بھائی کا خیال ان کی طبیعتوں سے جاتا رہے۔ محمود نے یہ حال سن کر پیغام بھیجا کہ والد مرحوم نے خانۂ سلطنت کو آراستہ چھوڑا مگر حال اس کا یہ ہے کہ چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرا ہوا ہے۔ اگر تمہاری عمر اور تجربہ اس کے سنبھالنے کے لائق ہوتا تو عین آرزو تھی کہ تم باپ کے جانشین ہوتے مگر مجھے مصلحت یہی معلوم ہوتی ہے کہ دولت اور خزانوں کو شریعت کے بموجب تقسیم کر کے دارالسلطنت کو میرے سپرد کر دو۔ تمہاری حکومت کے لئے بلخ اور خراسان کا ملک میں صاف کر دیتا ہوں۔

جب تاج سر پر اور خوشامدی گرد ہوتے ہیں تو ایسی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ محمود کی یہ بات پیش نہ گئی۔ جب اس نے دیکھا کہ میری نصیحت نے نہ اس نو دولت کو اثر کیا نہ ارکانِ دولت نے میرے حق کو حق سمجھا تو سوائے اس کے چارہ نہ دیکھا کہ خاص دارالخلافہ پر حملہ کر کے اس جھگڑے کا فیصلہ کرے۔

اسمٰعیل بھی ادھر سے فوج لے کر آیا اور اس میں شک نہیں کہ کوئی دقیقہ سپاہگری کا باقی نہ چھوڑا۔ مگر فتح شکست خدا کے اختیار ہے۔ آخر کو قید ہوا اور محمود کے نام کا نقارہ

غزنی کے نوبت خانے میں بج گیا۔ اس کے اقبال سے ایران اور توران کے ملک اس وقت اپنے اپنے حال میں گرفتار تھے۔ چنانچہ محمود نے پہلے اپنے گھر کا بندوبست کیا اور پھر آہستہ آہستہ سب کو زیر قلم کیا۔ ہندوستان جنت نشان جس کا دروازہ باپ نے کھولا ہوا تھا اُسے قنوج اور کالنجر تک گیارہ دفعہ زیر و زبر کیا اور اپنے نام کو سلطان کے لقب سے تاجدار کیا کہ اسوقت تک کسی بادشاہ اسلام کو نصیب نہ ہوا تھا۔ ایک دن مصاحبوں کے ساتھ بیٹھ کر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ صدہا کوس تک کوئی مملکت نظر نہ آئی جس کی فتح سے پُر مال خزانے کو مالا مال کرے ارکانِ دولت کو جمع کیا۔ سب نے خیال کے عیار اور فکر کے جاسوس چاروں طرف دوڑائے۔ آخر معلوم ہوا کہ اسی خراب آباد ہندوستان میں جسے گیارہ دفعہ پامال کر دیا ہے ملکِ گجرات میں سمندر کے کنارے ایک شہر عظیم الشان ہے اور اس میں ایک عبادت خانہ ہنود کا ہے کہ اپنے دیوتا کے نام سے سومنات کہلاتا ہے اور چونکہ ہزاروں ہزاروں برس ہوئے راجہ سے لے کر پرجا تک ملک ملک کی خلقت اسے صدقِ دل سے مانتی ہے اس لئے نہ مال و زر کا ٹھکانا ہے نہ زر و جواہر کی کچھ انتہا ہے۔ حسن میمندی نے زمینِ خدمت کو بوسہ دیا اور عرض کی کہ قبلۂ عالم میں نے وہاں کے حالات عجیب و غریب سنے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جس مکان میں سومنات دیوتا ہے باہر کی روشنی کو وہاں دخل نہیں۔ جواہرات اور الماس جو در و دیوار میں جڑے اور جڑاؤ قندیلوں میں لگے ہیں ان کی جگمگاہٹ سے دن رات برابر ہے۔ بیچ میں ایک بڑی بھاری سونے کی زنجیر لٹکتی ہے کہ اس میں گھنٹے اور گھڑیال آویزاں ہیں۔ جب پوجا کا وقت ہوتا ہے تو جس طرح ہم اذان دیتے ہیں وہ اسے ہلاتے ہیں کہ سب کو خبر ہو جائے۔ ملک ملک کے راجاؤں نے جو جاگیریں دے رکھی ہیں انہیں جمع کریں تو دو ہزار گاؤں ہوتا ہے۔ ہر چند کہ گنگا وہاں سے چھ سو کوس پرے ہے مگر روز تازہ گنگا جل سے اس کا اشنان ہوتا ہے۔ دو ہزار برہمن فقط وہاں کے پجاری ہیں۔ پانسو لونڈیاں گانے والیاں اور نہیں سو گوئیے ہیں کہ پوجا کے وقت بھجن گاتے ہیں اور ناچتے ہیں۔ زیور، لباس، خرچ اخراجات۔ ان کا سب وہیں سے ملتا ہے۔ یہ سب تو اُن کی باتیں ہیں مگر ہمارے مطلب کی بات یہ ہے کہ مال و زر اور زیور و جواہر کا وہاں یہ عالم ہے کہ اس کا عشر عشیر بھی کسی بادشاہ کے خزانے میں نہیں سما سکتا۔

یہ سن کر محمود کے دہانِ طمع میں پانی بھر آیا اور دل سانپ کی طرح لہرانے لگا اسی وقت

سپہ سالار کو حکم پہنچا کہ ہار لشکر تیار ہو۔ ہر علاقے سے سپاہ طلب ہوئی میدانِ شہر خیموں ڈیروں سے پٹ گیا۔ فوج فوج کے نشان جدا جدا لہرانے لگے۔ لشکرِ خاصہ کے علاوہ تاتار کے ترک اور کوہستان کے افغان لوٹ مار کی نیت باندھے شب و روز وزیرے سے بیٹھے رہتے تھے۔ ہزاروں کی جگہ لاکھوں جمع ہو گئے۔ اس ٹڈی دل کو لے کر اُٹا اور ملتان میں آکر دم لیا۔ ٹوٹے پھوٹے کی مرمت ساز و سامان کی درستی کی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ رستے میں ایسے ایسے ریگستان اور چٹیل میدان ہیں کہ جہاں کوسوں تک پانی کا پتا اور گھاس کا پتا نہیں ملتا اس لئے حکم دیا کہ ہر شخص کئی کئی دن کا کھانا پانی اپنے اپنے ساتھ اُٹھا لے اور سرکارِ شاہی سے بھی دو ہزار اونٹ رسد کے دانے پانی اور گھاس پات سے لدوا کر ساتھ لئے

غرض ان لق و دق میدانوں کو پیٹ سپیٹ کر دفعتہً اجمیر پر جا پہنچا۔ اگرچہ کوئی راجہ محمود کے حال سے غافل نہ تھا مگر یہ بھی خیال نہ تھا کہ ایسے میدان طے کر کے یہ طوفان یوں یکایک بجلی کی طرح آن گرے گا۔ اب سوا کنارہ کرنے کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ راجہ اور شہر کے لوگ جو بھاگ سکے وہ جان لے کر بھاگ گئے مگر اس آندھی سے شہر میں چراغ اور باہر تنکا تک نہ رہا۔ تارا گڑھ کا قلعہ سامنے پہاڑ پر چمک رہا تھا مگر دیکھا کہ اس کے محاصرے میں خدا جانے کتنے دن لگیں اور کیا پیش آئے۔ اس لئے سیدھا منزلِ مقصود کا رخ کیا۔ رستہ میں جو جو قلعے اور شہر نظر آئے انہیں ٹھکراتا اور سامانِ خداداد سمیٹتا دو منزلہ اور سہ منزلہ کرتا چلا جاتا تھا کہ سمندر کے کنارے پر ایک قلعہ عالیشان نمودار ہوا جس کا ایک ایک برج سر بفلک تھا اور دریا کی لہریں پاؤں میں لوٹ رہی تھیں۔ معلوم ہوا کہ شہر سومنات یہی ہے۔ اہلِ شہر بے خبر گھروں میں پڑے آنند کر رہے تھے۔ دیکھا تو یہی دیکھا کہ فوج کا دَل بادل چھا گیا ہے اور نشانِ محمودی لہرا رہا ہے۔ سب گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ پانڈے پجاری بھولے بھالے جنہوں نے کبھی ننگی تلوار نہ دیکھی تھی فصیل پر چڑھ کر حیرت سے دیکھنے اور چلانے لگے کہ اے مسلمانو تم اپنی فوج اور لشکر کے گھمنڈ پر ہمیں لوٹنے آئے ہو۔ یہ خبر تمہیں نہیں کہ دھرم مورت پرماتما ہمارا اسی واسطے تمہیں لایا ہے کہ جو جو مندر شوالے تم نے ہندوستان میں توڑے ہیں سب کی سزائیں دے گا۔ قاصد آئے انہوں نے بھی ایسے ہی پیغام سنائے مگر محمود ان باتوں کو کب خاطر میں لاتا تھا۔ تیوری بدل کر منہ پھیر لیا اور کہا کہ خیر جو کچھ ہوگا کل معلوم ہو جائے گا۔

وہ دن تو جوں توں کر کے کاٹا۔ دوسرے دن جب مشرق کا شہسوار ستاروں کی فوج کو

شکست دے کر شجاع کا خنجر ہاتھ میں لئے نکلا، محمود سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق ہوا۔ گھوڑے پر سوار، چتر لگائے میدانِ جنگ میں آ کھڑا ہوا۔ نقارے پر چوٹ پڑی کہ دل سینوں میں دہل گئے۔ دلیروں نے قلعہ کی طرف بڑھ کر ایسے تیر برسانے شروع کئے کہ ہندوؤں کو فصیل چھوڑتے ہی بن آئی۔ قلعے سے مندر میں بھی راہ تھی۔ سب گھبرا کر اُدھر گھس گئے۔ مسلمان جھٹ سیڑھیاں لگا، کمندیں ڈال فصیلوں پر چڑھ گئے اور اللہ اکبر اللہ اکبر کے نعرے مارنے شروع کئے کہ قلعے سے لے کر کوہ و دشت تک گونج اٹھا۔ تکبیر کی آواز سے برہمنوں اور پانڈوں کے دلوں میں گیان دھرم کی آگ سے ایک دھواں اٹھا اور راجپوتوں کے دلوں میں خونِ غیرت نے جوش مارا۔ دفعتاً آگ بگولا ہو کر دوڑے۔ جو تیر انداز فصیل پر کھڑے تھے ان سے آتے ہی چھری کٹاری ہو گئے اور سب کو کاٹ کر نیچے گرا دیا۔ پھر تو ادھر سے آتشبازی کے بان اور رال کی ہانڈیاں تھیں اور اُدھر سے تیروں کی بوچھاڑ اور برچھیوں کی بجلیاں۔ عالم گرد و غبار سے اندھیرا ہو گیا اور لڑائی برابر ترازو کا تول تلی ہوئی تھی مگر قلعے کا پلہ بھاری تھا۔ اتنے میں شام نے آ کر اندھیرے کی سپر بیچ میں رکھ دی۔ دونوں لشکر اپنے اپنے مقام پر آئے۔ شبخون کی روک تھام کا بندوبست ہوا۔ حکم تھا کہ چراغ کا تو کیا ذکر ہے آگ کی چنگاری تک نہ چمکنے پائے۔ مگر دلوں کی بے قراری اور مایوسی کچھ کہی نہ جاتی تھی۔ ادھر تو محمود کے لشکری سناٹے میں تھے کہ کہاں وہ کوہ و دشت پر بہار اور خدائی گلزار، کہاں یہ ریگستانِ بیابان! گھروں سے ہزاروں کوس آن پڑے۔ اللہ ہے جو پھر بھی اہل و عیال کا منہ دیکھنا نصیب ہو۔ اُوٹے طمع سیاہ، جس نے یہ دن دکھایا۔ لوٹ کا لالچ نہ ہوتا تو کیوں اس بلا میں پڑتے۔ کرتے تو کر بیٹھے مگر دیکھے کہ اب اونٹ کس کروٹ بیٹھے۔ اُدھر قلعہ بند بچارے مصیبت کے مارے جانوں سے نراس بیٹھے تھے اور کہتے تھے "ہے نرنکار یہ آسمانی بلا کہاں سے آ گئی۔ ہم تو اپنے گھروں آرام سے رام رام کی سُمرن جپتے تھے۔ تو ہی اس آفت کو ٹالے تو ٹلے، تیرے سوا کس کا آسرا ہے۔" غرض دونوں طرف سناٹے کا عالم تھا۔ اندھیری رات میں سنسان جنگل سائیں سائیں کرتا تھا۔ اور گھوڑے سے لے کر اونٹ تک سانس نہ لیتا تھا۔ ہاں تدبیروں کے قاصد اور کاغذ کے گھوڑے دوڑ رہے تھے۔ قلعے والوں کو رات بھر نیند نہ آئی دیس دیس کے ٹھاکروں اور راجاؤں کو چٹھیاں لکھیں کہ یہی وقت ہے اگر آج دھرم کی لاج نہ رکھی تو کب رکھو گے۔ ادھر آدھی رات تھی جو محمود کی آنکھ کھلی۔ دل گھبرایا اور اسی وقت سردارانِ لشکر کو بلا کر کہا کہ صبح سر پر کھڑی ہے بندوبست کرنا چاہیے کہ میدانِ جنگ

کس ڈھنگ پر ڈالا جائے۔ وزیر نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ جس طرح ہو سکے اس لڑائی کا فیصلہ جلد کرنا چاہیئے۔ ملک بیگانہ ہے اور عرصہ دُور کا ہے، جس قدر دیر ہو گی ہیبت ہماری کم اور جمعیت گھٹتی جائے گی۔ اور دشمن کی امدادیں پہنچ کر قوت بڑھتی جائے گی۔ ایک ایک سپاہی کے دل پر غلام کی نظر ہے۔ دیکھتا ہوں کہ رفیقوں کے جی چھوٹے جاتے ہیں۔ محمود نے اس رائے کو نہایت پسند کیا اور سب نے تائید کی۔ اسی وقت پس و پیش اور میمن و یسار کی تقسیم ہو کر ڈیرے ڈیرے میں حکم پہنچ گیا کہ صبح نُور کے تڑکے قلعہ پر دھاوا ہو جائے راتوں رات سینکڑوں سیڑھیاں اور کمندیں اور ہزاروں فولادی میخیں تیار ہو گئیں۔ تمام رات بہادروں نے ہتھیاروں کی تیاری میں کاٹی۔ جب پچھلی پہر رات باقی رہی تو ستاروں کے پہرہ دار اپنے پہروں پر قائم تھے جو محمود نے وُضو کر کے دوگانہ نماز کا ادا کیا۔ سلاح جنگ زیب بدن کرتے ہی سواری کا حکم دیا۔ ادھر صبح کی سفیدی مشرق سے نمودار ہوئی، اُدھر سُرخ پھریرا نشان جنگ کا ہوا میں لہرایا۔ جب سپہ سالار کو تیسرا حکم پہنچا تو اُس نے خود کرنا ہاتھ میں لے کر منہ پر رکھی اور جس طرف سے دھاوے کا موقع تھا اُدھر سے پہلو دے کر دوسرے رخ سے لڑائی ڈالی۔ محمود بذاتِ خاص ایک رسالے کو لئے کھڑا ہوا کہ جب قلعے والے فوج کی طرف جھکیں تو یہ اُدھر سے کمندیں ڈال کر اندر جا پڑے۔ قلعے میں بھی تمام رات آنکھوں میں کٹی تھی۔ پانڈے پجاری برہمن راجپوت دھاوے کا غل سُن کر گھبرا گئے۔ پہلے تو سب مندر کی طرف دوڑے اور سُومنات کی پرتما سے لپٹ لپٹ کر زار زار روئے کوئی پاؤں میں لوٹتا تھا کوئی زار و نیاز سے کھڑا دعا مانگ رہا تھا۔ آخر روتے دھوتے باہر نکلے، جدھر کو دھاوے کا زور دیکھا سب کے سب ادھر ہی اُمنڈ پڑے اور لڑائی شروع ہو گئی۔ چاروں طرف سے خبریں چلی آتی تھیں اور تدبیر کی نظر ہر طرف برابر دوڑ رہی تھی۔ اتنے میں ایک پہرے کے سپاہی نے محمود کو رپٹ دی کہ اِدھر سے غبار نمودار ہوتا ہے اور رخ اس کا اسی طرف معلوم ہوتا ہے۔ عجب نہیں کہ کوئی راجہ قلعے کی مدد کو پہنچا ہو۔ اسی وقت سانڈنی سوار اور ہرکارے دوڑ گئے۔ دم کے دم میں پھر کر آئے اور خبر لائے کہ فلاں فلاں شہر کے راجا اس اس قدر فوج کی جمعیت سے آن پہنچے۔ شاہ باتدبیر نے اس خبر کو یہیں بند رکھا کہ اگر لڑتی ہوئی فوج کو یہ خبر وحشت ناک پہنچی تو سارے لشکر میں ہل چل پڑ جائے گی۔ فوراً اپنی رکاب کی فوج لے کر برق و باد کی طرح لپکا اور اس کالی آندھی کے سامنے جا کر پہاڑ کی طرح ڈٹ گیا۔ اوّل پیغام بھیجا کہ اس وقت قلعہ والوں سے ہمارا مقابلہ ہو رہا ہے

شایانِ جوانمردی یہ ہے کہ جب تک ہم اُدھر سے فارغ نہ ہولیں تم ہم پر حملہ نہ کرو۔ انہوں نے کہلا بھیجا کہ قلعہ اور ہم کچھ جدا نہیں۔ زبانی باتیں نہ بناؤ مرد ہو تو تلوار لے کر سامنے آؤ۔ محمود کو اتنی فرصت بھی کافی تھی یہ دایاں بایاں سرداروں کو بانٹ، فوج کا قلعہ باندھ، قلب میں قائم ہو چکا تھا۔ اِدھر سے کرنا اور اُدھر سے نرسنگا لڑائی کا پھونکا گیا۔ پہلے تو تیر و خدنگ سے پیغام و سلام موت کے آئے۔ مگر اِدھر ہندوستان کے سُورما اُدھر ترک طرار اور افغان خونخوار بڑھ بڑھ کر حملے کرنے لگے۔ جنگ کا ہنگامہ گرم ہوا۔ تلوار کی آنچ سے خود و زرہ کے نیچے بدن بہادروں کے جل اٹھے اور خون پانی ہو کر بہ گئے کہ دفعتہً ایک طرف سے غبار اٹھا سب کی آنکھیں اُدھر لگ گئیں۔ جب غبار کے دامن کو مقراضِ ہوا نے چاک کیا اور گرد کے گریبان سے نشانِ لشکر نے سر نکالا تو معلوم ہوا کہ نہروالہ کا راجہ بھی آیا۔ اس خبر کو سُن کر کیا ترک کیا افغان کے ہاتھ پاؤں پھُول گئے اور محمود کے بھی اوسان بھول گئے۔ مگر پھر سنبھلا۔ ادھر جو فوج قلعے پر لڑ رہی تھی اسے پیغام بھیجا کہ قلعے کا پیچھا چھوڑو اور یہاں کی خبر لو۔ ادھر گھوڑے سے کود جبینِ نیاز کو اپنے خدا کے سامنے خاکِ عجز پر رکھدیا اور دیر تک درگاہِ الٰہی میں گریہ و زاری کی دعا مانگتا رہا۔ بعد ازاں اٹھا اور فوج کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ اے شیر و دلیر! دیکھو دشمن نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ خراسان اور ترکستان یہاں سے سینکڑوں نہیں ہزاروں کوس کا پلہ ہے۔ اگر پر بھی لگا کر اُڑو گے تو جان لے کر وہاں نہ پہونچ سکو گے۔ اے مسلمانو! با ایمانو! اب سوائے خدائے وحدہٗ لاشریک کے کسی کا سہارا نہیں یا اس کا آسرا ہے یا ہمتِ مردانہ اور بازوئے دلیرانہ کا۔ بھاگ کر مرنے سے مار کر مرنا بہتر ہے۔ نام تو رہے گا کہ غازی بھی ہوئے اور شہید بھی۔ دیکھو اس میدان سے گھر دُور ہے مگر بہشت قریب ہے، شہادت کا تاج سر پر لو اور بہشت میں داخل ہو۔ اس تقریر کا افسوں اس وقت پر ایسا کام آیا کہ ٹوٹی ہوئی کمریں پھر بندھ گئیں۔ سب یکدل و یکجان ہو کر ٹوٹ پڑے اور ایسا جی توڑ کر حملہ کیا کہ ایک دھاوے میں پانچ ہزار کا کھیت ڈال دیا جو باقی رہے ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ فتح یابوں نے کئی کوس تک پیچھا کیا زخمیوں کی کمریں ٹٹول کر اور مُردوں کی ہمیانیاں کھول کھول کر کمر کیسے خوب ٹھوک کر بھرے۔ قیدیوں کو کون پکڑتا کہ پہلے ہی غزنی کے گھر بار اور ایران توران کے بازار لونڈی غلاموں سے بھرے پڑے تھے۔ اس فتح کا حال دیکھ کر قلعہ والوں کی رہی سہی آس بھی ٹوٹ گئی۔ محمود مع فوج کے فتح کا نقارہ بجاتا قلعہ میں داخل ہوا اور دروازے پر

نشانِ محمودی لہرانے لگا۔ اب دل کو تاب کہاں تھی۔ سیدھا مندر میں پہنچا۔ عمارت کی شان و شوکت دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں۔ چھپن ستونوں پر گنبدی چھت بیضۂ عنقا کی طرح دھری تھی کہ ہر ستون ایک ڈال سنگ مرمر کا ترا شا ہوا تھا اور سر سے پاؤں تک جواہرات سے مرصع تھا۔ پچی کاری کی گلکاری چین کے نقش و نگار مٹاتی تھی اور کندن کی ڈلک ستاروں پر آنکھ مارتی تھی۔ بیچوں بیچ میں ایک جڑاؤ زنجیر لٹکتی تھی۔ اس میں ایک سونے کا چراغ دن رات دھڑ دھڑ جلتا تھا۔ خدا جانے کن وقتوں سے اسی طرح روشن چلا آتا تھا جس کی قسمت میں آج کے دن اس آندھی سے گُل ہونا لکھا تھا۔ دروازے کے سامنے سومنات دیوتا کھڑے تھے جن کا قد پورا پانچ گز کا تھا کہ دو گز زمین میں اور تین گز باہر نمودار تھے۔ محمود نے خود ایک تیر کمان میں جوڑ کر اس کی ناک پر مارا اور توڑنے کا حکم دیا۔ تمام پجاری بیچارے دوڑ کر پاؤں پر گر پڑے اور کہا کہ اسے نہ توڑو اور بہت سے خزانے نذرانے لو۔ وزیر نے بھی سفارش کی مگر بادشاہ نے سوچ سوچ کر کہا کہ میرے نزدیک بُت فروش نام پانے سے بت شکن ہونا بہتر ہے۔ یہ کہہ کر گرزِ فولادی جو ہاتھ میں تھا اس زور سے مارا کہ وہ پُتلا جو سونے کی ڈلی اور اندر سے کھوکھلی تھی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر پڑی۔ اقبال کے خزانے پر نظر کرو کہ جو روپیہ پجاری دیتے تھے اس سے چند در چند زیادہ کا جواہرات اس میں سے نکل پڑا۔ محمود مارے خوشی کے باغ باغ ہو گیا۔ دو ٹکڑے اس کے مکّہ اور مدینہ بھیجے اور دو غزنی کو بھجوائے کہ ایک جامع مسجد اور ایک دیوانِ عام کے دروازے پر ڈال دیں۔[۱] زر و جواہر اور مال و دولت اس قدر ہاتھ آیا کہ تمام عمر کی لوٹ کو بھول گیا اور چند روز کے بعد غزنی کو پھرا۔ جب ان لڑائیوں اور فتح یابیوں کی دفترِ تقدیر میں جگہ نہ رہی تو خاتمے کا وقت آیا۔

سنہ ۱۰۳۰ ۴۲۱ میں ۶۳ برس کی عمر ۳۲ برس کی سلطنت کے بعد پیمانۂ عمر لبریز ہوا اور مرض نے ایسا زور پکڑا کہ اسے بھی زندگی کی آس نہ رہی۔ حکم دیا کہ سارے جواہر خانے اور دولت کے خزانے لا کر دربار میں سجاؤ۔ ان خدائی خزانوں کی کون سے مکان میں سمائی ہوتی۔ باہر شہر کے ایک میدان میں خیمے ڈیرے، شامیانے سراپردے کھڑے ہو گئے۔ کشمیری پشمینے، بنات، سقرلات، اطلس فرنگی، دیبائے رومی، کاشانی مخمل، ایرانی قالین، فرش فروش، پردوں اور آئین بندی سے نگار خانۂ چین کر دیا۔ ہزاروں لاکھوں روپیہ کے توڑے، اشرفیوں کی تھیلیاں،

---

[۱] تاریخ فرشتہ کا مصنف گیارہویں صدی ہجری میں لکھتا ہے کہ اب تک وہ ٹکڑا مقامِ مذکور پر پڑا ہے۔

شیشہ اور بلور کی ڈبیوں میں لعلِ بدخشاں، جواہر آبدار، گوہر شاہوار، تاج مرصع، جڑاؤ تخت، سونے چاندی کی کرسیاں۔ اس کے علاوہ ہزاروں نادر نفایس اور گراں بہا عجائب سے اس مقام کو ایسا سجایا کہ طلسمات کا عالم ہوگیا۔ وہ محمود جس کی ران کے نیچے عمر بھر اقبال کا گھوڑا بجلی کی طرح چمکتا رہا ایک نالکی میں تصویرِ بیجان کی طرح بیٹھا ہوا آیا۔ گلاب سے بھرے پر مُردنی چھائی تھی اور آنکھوں سے حسرت ٹپکتی تھی۔ غلاموں نے بغلوں میں ہاتھ دیکر اٹھایا عصا کے آسرے سے آہستہ آہستہ آیا اور تکیوں کے سہارے سے تختِ زرنگار پر بیٹھ گیا۔ ضعف کے مارے پیشانی پر پسینہ آتا تھا۔ اور رومال سے پونچھتا جاتا تھا۔ وہ امراء کہ خوں ریزیوں کی مصیبتوں میں جان و تن سے شریک رہے تھے۔ سر جھکائے کھڑے تھے اور سب پر ایک اُداسی کا عالم چھایا ہوا تھا۔ محمود نے پہلے تمام دربار کو نظر یاس سے دیکھا پھر جو نقد و جواہر خلقِ خدا کے کلیجوں میں ہاتھ ڈال ڈال کر اکٹھے کئے تھے ان پر نظر ڈالی۔ مگر جدھر نگاہ جا پڑتی تھی اٹھ نہ سکتی تھی۔ ٹھنڈی سانس بھرتا تھا اور رہ جاتا تھا۔ پھر حکم دیا کہ اصطبل اور فیل خانے اور شتر خانے کے نادرات بھی لاؤ۔ وہ بھی زرکار جھولوں اور مرصع نگار زیور و سازسے سجے ہوئے آئے۔ کثرت ان کی کیا بیان ہو کہ دور دور تک جنگل اور پہاڑ جگمگ جگمگ کرنے لگے۔ نالکی میں سوار ہو کر انہیں دیکھا۔ آہیں سرد بھریں اور زار زار رویا مگر حیف کہ ہاتھ نہ اٹھا جو ایک پیسا کسی کو دیتا۔ آخر جان دی اور دنیا سے کوچ کیا۔

شہابُ الدّینْ غوری

جب غزنوی حکومت میں ضعف آیا تو غیاث الدین اور شہاب الدین دو بھائی غور کے خاندان سے نکل کر تختِ غزنی پر قائم ہو گئے۔ ان میں سے غیاث الدین تو تاجدار تھا اور شہاب الدین سپہداری کر کے بڑے بھائی کی اطاعت کا حق ادا کرتا تھا۔ شہاب الدین نے پنجاب میں آکر کئی معرکے مارے اور سنا کہ بھٹنڈا قدیم سے راجگانِ عظیم الشان کا دار السلطنت چلا آتا ہے۔ چنانچہ اس پر فوج کشی کی اور جنگِ عظیم کے بعد فتح یاب ہوا۔ سب بندوبستوں سے فارغ ہو کر ایک دن دربارِ عام کیا۔ امیر و وزیر، سپہ سالار، بخشی سب اپنے اپنے عہدوں پر حاضر تھے اور گفتگو یہ ہو رہی تھی ... کہ دار الخلافے کو چلنے کے لئے کونسی تاریخ مقرر کی جائے۔ دفعتہً سرحد کے سردار کا عریضہ پہنچا کہ رائے پتھورا والی اجمیر اپنے بھائی کھانڈے راؤ حاکمِ دہلی کو ساتھ لے کر دو لاکھ فوج جرار اور تین ہزار فیلِ جنگی سے بھٹنڈے کے چھڑانے کو آندھی اور بھونچال کی طرح چلا آتا ہے۔ اقبالِ خداوندی کی توجہ واجب ہے نہیں تو اس ملک ہند میں زن و بچے مسلمانوں کے تباہ ہو جائیں گے۔ بادشاہ نے اسی وقت لشکرِ اسلام میں منادی کر دی کہ جب تک اس مہم کا فیصلہ خاطر خواہ نہ ہو جائے مسلمان باایمان کو غزنی کی طرف قدم اٹھانا حرام ہے۔ ساتھ ہی لشکر کی تیاری کا حکم اور رستے کے کارواروں کے نام سامانِ رسد کے حکم نامے جاری ہو گئے۔ لشکرِ جرار منزل بہ منزل یلغار کرتا جاتا تھا جو انبالہ کے ڈیروں پہ خبر لگی کہ لشکر راجہ کا پانی پت کے مقام پر ہے مگر فیل خانہ کرنال میں آگیا۔ بادشاہ نے وہیں مقام کر دیا اور فوج کو پس و پیش سے درست کر کے کوچ بکوچ آگے بڑھا۔ تلاوڑی[1] کے میدان میں دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہو گیا۔ دن مورچوں کی درستی میں گزرا، شام کو سب نے گھوڑوں کے تنگ ڈھیلے کر دیئے۔ دانہ چڑھا، زین پوش بچھا کر بیٹھ گئے۔ باگ ڈوریں زانوؤں سے باندھ لیں اور خرجیوں سے روٹیاں نکال کر کھانے لگے۔ شہاب الدین

---

[1] اس زمانے میں اسے ترائن کہتے تھے۔

ابھی خاصے ہی پر تھا کہ گشت کے سواروں نے دشمن کی فوج کے چند گھسیارے اور لکڑہارے جنگل سے پکڑ کر حاضر کئے۔ سواروں کو انعام دے کر رخصت کیا اور ان لوگوں کو مودھی کے سپرد کیا کہ جو کچھ مانگیں انہیں کھلاؤ پلاؤ۔ آدھے نیچے سامنے بلایا۔ سب کے سب جنگلی گنوار تھے مگر وہ بڈھے ہشیار اور تجربہ کار نکلے کہ جن سے لشکر کے اُتارے کا رُخ، فوج کی تعداد، پیچھے کی مدد، رسد کے بندوبست، غرض ڈیرے ڈیرے کا حال معلوم کر لیا۔

تمام رات فوج کی قسمت اور مورچوں کی تقسیم میں گزری۔ پچھلی پہر رات تھی کہ کمر بندی کا حکم پہنچا۔ صبح ہوتے ہوتے تمام لشکر کیل کانٹے سے لیس ہو کر میدان میں جم گیا۔ آگے پیچھے دائیں بائیں ہر ایک سردار اپنی اپنی فوج کو سنبھالے تھا۔ خود صاحبِ لشکر زرہ بکتر، چار آئینہ سجے، سر پر خود فولادی، کمر میں شمشیر اصفہانی، پشت پر سپر، کندھے پر کمان، زین پر گرز گاؤ سر دھرا، کمندِ ابریشمی شکاربند میں آویزاں، علم کے سایہ کے نیچے نیزہ تانے کھڑا تھا۔ اور اسپ عربی جس پر پوستِ پلنگ کی پاکھر پڑی تھی، رانوں میں سے نکلا جاتا تھا ادھر حریف کے لشکر میں پہلے ہاتھیوں کی قطار، بعد اس کے رتھیں اور بہلیں، پیادہ اور سوار فوج تھی کہ جس کا شمار سوائے منشئ تقدیر کے کسی کو معلوم نہیں۔ ہاں سلسلۂ انتظام اس کا خاص ایک شخص کی چٹکی میں تھا کہ جدھر چاہے ادھر جھونک دے۔ بیچوں بیچ میں ہند کا سیناپتی، کمر سے پاؤں تک اونچی بنا ہوا، زرد و گلے پر چلپا اور اس پر زرہ بکتر چار آئینہ سجے راجپوتی ایک پیچ بھوں پر رکھے، کمر میں ایک طرف سروہی کی تلوار، دوسری طرف کھانڈا اور کٹار، پشت پر گینڈے کی ڈھال، سورج مکھی کے سایہ میں ہاتھی پر بیٹھا دونوں لشکروں پر نظرِ غور سے دیکھ رہا تھا۔ آخر نہ رہ سکا اور تڑپ کر ہاتھی سے کود، گھوڑے پر سوار ہوا۔ بھائی کو ہاتھی پر بٹھا دیا۔ آپ دکھنی گھوڑی اڑاتا سپاہ گری کا بانکپن دکھاتا، بھالے کے ہاتھ نکالتا ہوا، دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں تک ایک چکر لگایا، اور سامنے لشکر کے کھڑے ہو کر اہلِ لشکر کے دلوں کو اس طرح بڑھایا کہ اے راجپوتوں کے سپوتو! پہاڑوں کے افغان اور تاتار کے ترکوں کا سامنا ہے۔ ملیچھ مسلمان ہیں اور سنت دھرم کے بھرشٹ کرنے پر کمریں باندھ کر آئے ہیں۔ ابھی تک تمہاری سرحد پر کھڑے ہیں اگر ہمت کرو تو کچھ مال نہیں۔ خرگوشوں کی طرح جھاڑیوں میں بھگا بھگا کر مار لوگے اور اگر ایک قدم تمہارا ہٹا تو پاؤں ان کے ہمارے تمہارے گھروں میں اور ہاتھ ننگ و ناموس میں ہیں۔

آج دھرم گیان کی لاج تمہاری تلوار کی باڑ پر ہے۔ مارو مارو دم نہ لو اور جانے نہ دو۔ راجہ ابھی یہ تقریر تمام نہ کر چکا تھا کہ اتنے میں لشکرِ شاہی کے بائیں ہاتھ پر جو افغان پرا جمائے کھڑے تھے آگے بڑھے اور خلجیوں نے بھی باگیں لیں۔ انہیں دیکھ کر راجپوت بہادروں کے سپوت جن کی تلواریں میانوں میں مچھلی کی طرح تڑپی جاتی تھیں، ہاتھیوں کی صف کو چیر کر نکل آئے۔ تیر برساتے ہوئے دوڑے اور ایک دم میں برچھیوں پر لے لیا۔ جب یہ حال دیکھا تو افغان پیچھے ہٹے اور خلجیوں کے پرے نے بھی گھونگھٹ کھایا۔ مگر سپہ دار بے سپاہ قلب میں اسی طرح جما ہوا تیر مارے جاتا تھا جو ایک مصاحب نے آکر عرض کی کہ افغان اور خلجیوں نے پیٹھ دکھائی۔ جن نمک خواروں سرداروں سے پسینے کی جگہ خون گرانے کی امید تھی وہ جان بچا کر بھاگ گئے۔ دشمن چڑھا چلا آتا ہے۔ حضور اب کس کی راہ دیکھتے ہیں۔ بولے خدا گھوڑے کی باگ پھیر دیجئے۔ اب لاہور میں پہنچ کر بد اندیشوں کا بندوبست قرار واقعی ہو جائے گا۔ یہ سنتے ہی بادشاہ شعلے کی طرح بھڑک اٹھا۔ رہی سہی فوج کو سمیٹ کر للکارا اور گھوڑے کو ڈپٹا کر برق کی طرح دشمن پر جا پڑا۔ نیزہ اور شمشیر سے گذر کر فقط خنجر اور کٹار پر نوبت آگئی۔ اتنے میں کھانڈے راؤ کی نظر بادشاہ پر پڑی۔ فیلبان کو آواز دی کہ خبردار جانے نہ پائے۔ اس نے ہاتھی کو ریلا۔ شہاب الدین بھی چمک کر اس طرح جھپٹا کہ گھوڑے کے دونوں ہاتھ ہاتھی کے مستک پر بیٹھے اور ہاتھی کے منہ میں ایسا نیزہ مارا کہ کئی دانت اس کے ٹوٹ گئے۔ مگر خود زخمِ کاری کھایا۔ ڈگمگا کر گھوڑے سے گرا چاہتا تھا کہ ایک غلام باوفا جست کر کے پیچھے جا بیٹھا اور گھوڑا اڑا کر برق کی طرح نظروں سے غائب ہو گیا۔ غرض بھاگے بھٹکے سپاہی اور ٹوٹا پھوٹا لشکر پھر لاہور میں آیا اور یہاں کے ملک کا بندوبست کر کے غزنی کو روانہ ہو گیا۔ اس لڑائی میں تماشا یہ ہوا کہ جن جن سرداروں کو بہادری اور جاں نثاری کے بڑے بڑے دعوے تھے اور بادشاہ کو بھی ان پر بھروسے تھے، وہی میدانِ جنگ سے بھاگ گئے تھے۔ چنانچہ غزنی میں پہنچ کر علما سے فتویٰ طلب کیا کہ جو مسلمان جہاد سے بھاگے اس کے لئے کیا حکم ہے۔ سب نے لکھا کہ وہ گنہگار خدا ہے۔ بادشاہ نے حکمِ شرع ہاتھ میں لیا اور تمام سرداروں کو گرفتار کیا۔ جو اور چنے گھوڑوں کے توبڑوں میں ڈال کر انہیں پہنا دیئے اور بازاروں میں چھوڑ دیا کہ خاص و عام عبرت پکڑیں اور جو نہ کھائے اس کا سر الگ۔ پھر یہ نشتر تو معاف

ہو گئی مگر دربار سے بند ہو گئے۔

دوسرے برس سالِ نوروزی نے پلٹا کھایا۔ بادشاہ نے اندر ہی اندر سب سامان کر رکھے تھے۔ فہرست منگا کر دیکھی اور ہر کارخانے میں حکم کوچ کا بھیجدیا۔ آٹھویں دن خود سوار ہوا۔ جب پشاور میں پہنچا تو ایک پیرمرد دیرینہ سال کہ غوری کے خاندان میں سے تھا اور خلوت کی صحبتوں میں بے تکلف تھا اُس نے عرض کی کہ اس مہم میں سامان تو جنگِ عظیم کا نظر آتا ہے مگر کُھلتا نہیں کہ ارادہ کدھر ہے؟ بادشاہ نے آہِ سرد بھر کے کہا کہ اے مردِ مسلم! عجب ہے کہ اِس سن و سال پر تیرا یہ سوال ہے۔ اگلے برس کی شکست تجھے یاد نہیں۔ آیا وہ صدمہ اسلام کے شیشہ عزت کے لئے کچھ چھوٹا پتھر ہے؟ پھر قبا کے بند کھولے اور کہا کہ دیکھ لے اُس دن سے آج تک نہ میں نے کپڑے بدلے ہیں نہ حرم سرا میں بستر پر سویا ہوں۔ اس پیرمرد نے دعائے خیر دی اور کہا کہ اگر یہ بات ہے تو اب مصلحتِ وقت کے بموجب کام کرنا چاہیئے یعنی جو جو سردار غضب شاہی میں دربار سے بند ہوئے ہیں، انہیں پھر دربار میں بلا کر انعام دیجیئے اور ترقی کے وعدوں سے دل بڑھایئے کہ جان لڑا کر پہلے داغ کو دھوئیں۔ چنانچہ ملتان میں آکر چند مقام کئے۔ دربار عام کر کے سب سرداروں کو بلایا اور کہا کہ اے مسلمانو سالِ گذشتہ میں جو داغ دامنِ اسلام پر آیا سب پر روشن ہے اور تدارک اس کا ہر مومن مسلمان پر واجب ہے۔ وہ اگلی ندامت کے سبب سے کچھ نہ کہہ سکے مگر سب نے تلواروں پر ہاتھ رکھ کر سامنے سر جھکا دیئے۔ غرض وہاں سے روانہ ہو کر لاہور پہنچا اور سید قوام الملک رکن الدین کو کہ تدبیر اور تقریر میں بے مثل تھا ایلچی کر کے نامے کے ساتھ روانہ کیا۔ نامے کا مضمون یہ تھا کہ میں بموجب حکم اپنے بڑے بھائی کے کہ میرے باپ کی جگہ ہے اور خراسان سے پنجاب تک مسلمانوں کا بادشاہ ہے فوج لے کر اس طرف آیا ہوں۔ رائے پرتھی راج کہ راجگان ہندوستان میں مہاراجہ ہے اسے لکھا جاتا ہے کہ اسلام کی اطاعت کر کے اتفاق کا طریقہ قائم کرے تاکہ خلقِ خدا کی آسائش میں خلل راہ نہ پائے۔ نہیں تو ملک خدا کا ہے اور حکم خدا کا، تلوار دونوں کا فیصلہ کرے گی۔

جب یہ مراسلہ راجہ کی نظر سے گزرا تو بہت خفا ہوا۔ اِدھر تو ایک جواب کہ پتھر اور لوہے سے بھی کڑا تھا لکھ کر روانہ کیا اور اُدھر راجگان ہندوستان کو جمع کر کے تین لاکھ راجپوتوں کا لشکر جن کی تلواروں سے خون ٹپکتا تھا ہمراہ لے کر چلا۔ پہلی فتح کے بھروسے پر بہت سے راجہ

بہادرانہ رفاقت کے دم بھرتے مدد کو آئے۔ شہاب الدین بھی ادھر سے آگے بڑھا اور نہر سرسوتی کو بیچ میں ڈال کر دونوں لشکر اُتر پڑے

پرتھی راج نے بھی اوّل ایک خط اس مضمون کا لکھا کہ حال اس فوجِ بے شمار کا سپہ دارِ اسلام کو معلوم ہُوا ہوگا مگر اس کے علاوہ بھی ہندوستان سے برابر فوجیں چلی آتی ہیں۔ ایک ایک راجپوت وہ من چلا بہادر ہے جس کی تلوار کی کابل اور قندھار تک پناہ نہیں۔ یہ چند نامراد ترک بچے اور افغان نادے جنہیں لوٹ کھسوٹ کا لالچ دے کر گھروں سے یہاں لایا ہے، چاہیئے کہ ان کی جوانی اور ماں باپ کے بڑھاپے پر رحم کر کے یہیں سے پھر جائے۔ ہمیں جانِ جوانمردی کی قسم ہے کہ پیچھا نہ کریں گے اور نہیں تو دیکھ لو کہ آتش بازی کے سامان بے شمار ہیں اور جنگی ہاتھی کچھ اوپر تین ہزار ہیں اگر اس تحریر پر خیال کیا تو بہتر ہے نہیں تو یاد رہے کہ ایک جاندار اس میدان سے جیتا نہ جائے گا۔

شہاب الدین اس موقع پر دھیما ہُوا اور جواب میں لکھا کہ راجہ نے جو نیک صلاح دی، عین شفقت ہے مگر سب پر روشن ہے کہ اس لشکر کشی میں مجھے کچھ اختیار نہیں۔ بھائی کے حکم سے اس مہم کا بوجھ سر پر لیا ہے جب تک وہاں سے حکم نہ آئے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اس قدر مہلت ہو کہ وہاں سے جواب آجائے اس وقت صلح اس عہد پر ہو جائے گی کہ ملک پنجاب سرہند تک ہمارے پاس رہے، باقی کل ہندوستان تمہارا۔

جب یہ ناقوت جواب راجہ کے پاس پہنچا تمام اہلِ دربار ہنسنے لگے اور لشکر میں فتح کی سی خوشیاں ہو گئیں، بلکہ بےنچنت ہو کر ڈیرے ڈیرے میں ناچ رنگ شروع کر دئے۔

وہاں شہاب الدین نے سرِ شام فوج کو کمر بندی کا حکم دے کر خیمے ڈیرے سب قائم رکھے اور راتوں رات کئی کوس کا چکر دے کر دریا پار اتر گیا۔ صبح کو راجہ کے لشکر میں ابھی کوئی بستر پر تھا کوئی اشنان کو گیا تھا کہ دفعتہً پہلو میں آ، دمامۂ جنگی پہ چوٹ لگا، اس زناٹے سے کرنا بھپنکی کہ سوتے جاگتے سب اچھل پڑے، تمام فوج میں کھلبلی پڑ گئی۔ وہ لشکر بے شمار ایسا دریا تھا کہ ایک طرف کی ہل چل کی دوسری طرف خبر بھی نہ ہوتی تھی مگر راجہ نے اس وقت ہوش و حواس کو جمع کیا ذرا نہ گھبرایا۔ ایک فوج تو تیار کر کے سامنے کی اور باقی ساقی انبوہ کو سمیٹ کر پھر میدان میں لا جمایا۔ ادھر شہاب الدین نے فوج کے چار حصے کر کے چار سپہ سالاروں کے ماتحت قائم کر دیئے کہ باری باری سے جائیں اور اس لشکر شیر کے

مقابل میں جان لڑائیں۔ راجپوت بہادر بھی اس میدان میں دائیں بائیں سے درست ہوکر اس خوبصورتی اور بندوبست کے ساتھ لڑے کہ مسلمانوں کے جی چھوٹ چھوٹ گئے۔ تب شہاب الدین شکست کی صورت بنا کر پیچھے ہٹا۔ حریف نے پیچھا کیا۔ جب جمعیت ان کی بے انتظام ہوئی تو دوسرے غول سے تازہ دم حملہ کیا۔ مگر جمعیت ہندوؤں کی بے شمار تھی۔ اس لئے اس سے بھی مطلب نہ حاصل ہوا جب ٹھیک دوپہر ہوئی تو راے پتھی راج ایک سو پچاس راجہ اور مہاراجہ کو لے کر ایک درخت کے سایے میں آیا۔ سب نے تلواروں کے قبضوں پر ہاتھ رکھ رکھ کر قسم کھائی اور ایک ایک پیالہ شربت کا پی، پان کا بیڑا منہ میں، تلسی کی پتی زبان پر رکھ، کیسر کے ٹیکے پیشانیوں پر دیئے۔ اُدھر شہاب الدین بھی بارہ ہزار غلام خاص جن کے سروں پر فولادی خود جواہرات سے مرصع دھرے ہوئے تھے، انہیں لے کر جدا ہوا۔ اوّل خود تاجِ شاہی اتار کفن سر سے باندھا، پھر شمشیر اصفہانی گھسیٹ میان اس کا توڑ کر پھینک دیا۔ بادشاہ کا یہ حال دیکھتے ہی سب نے خود خورجیوں میں ڈال کفن سروں پر لپیٹ لئے۔ اور ایسا ہی تلواریں کھینچ، ڈاڑھیاں منہ میں لے، اس طرح جوش میں آکر حملہ کیا کہ یا تو اپنی جگہ جمے کھڑے تھے یا ایک مارتے خاص راجہ کے قلب لشکر میں جا کر دھواں دھار ہو گئے اور جو جو سر لشکر اِدھر اُدھر لڑ رہے تھے وہ بھی دائیں بائیں زور دے کر گر گرے۔ اس گھمسان کا رن پڑا کہ دم کے دم میں ہزاروں کا کھیت پڑ گیا۔ اگرچہ راجپوت تلواروں نے بڑا ساکھا کیا، مگر انجام شکست کھائی۔ کھانڈے راؤ میدان جنگ میں بہادری کا حق ادا کر کے زندگی کے بوجھ سے سبکدوش ہوا۔ راے پتھورا دریائے سرستی کے کنارے گرفتار ہو کر مارا گیا۔ تمام فوج پریشان ہو گئی۔ فتح یاب سپاہی شام تک قتل و غارت میں ہاتھ رنگتے رہے۔ بادشاہ نے راتوں رات لاہور اور غزنی کو فتح نامے روانہ کر کے دوسرے دن لشکر کا انتظام کیا اور آگے روانہ ہوا۔ بعد ازاں اجمیر کو جو دارالحکومت راجہ کا تھا فتح کرتا ہوا دلی میں آیا اور اِدھر ہی کے راجاؤں کو تاج بخشیاں کرتا کچھ اپنے حاکم بٹھاتا دلّی سے لاہور اور لاہور سے غزنی میں پہنچا۔ کئی برس کے بعد کوہاٹ کے رستے ہندوستان سے پھرا ہوا جاتا تھا چند گکھڑ جن کی قوم کی کثرت اور غارت گری کا شہرہ اس زمانے میں بڑے زور شور پر تھا، رات کو خیمہ پھاڑ کر چپکے سے اندر گھس گئے اور بادشاہ کو مار ڈالا۔

شہاب الدین بھائی کے مرنے کے بعد ۱۲۹۶ء سنہ ۶۹۵ھ میں بادشاہ ہوا اور ۱۳۱۶ء سنہ ۷۱۶ھ میں قتل ہوا۔

علاؤالدّین اور کولا دیوی

علاؤالدین خلجی ایک بادشاہ ہندوستان کا تھا جب تخت پر بیٹھا خزانوں کے منہ کھول دیئے اور داد و دہش کے ساتھ عیش و عشرت کی محفلیں گرم کر دیں۔ امن اور ارزانی اس کے عہد میں ایسی ہوئی کہ کسی بادشاہ کو نصیب نہ ہوئی تھی۔ فتح نصیب ایسا کہ سیت بند رامیشور پر جا کر مسجد کے مینار بلند کئے۔ علما فضلا خدا پرست، شاعر، حکیم گھیتے، نجومی معمار غرض ہر فن کے صاحبِ کمال وہ پائے کہ جن کا نظیر پھر نظر نہ آیا۔ چنانچہ اکثر علماء کی کتابیں، نظام الدین اولیاء کے نصائح، امیر خسرو کی تصنیفات اب تک موجود ہیں۔ بادشاہی شان و شوکت کو بھی بہت بڑھایا بلکہ ہاتھی پر عماری پہلے اسی نے رکھی ؛

ہر چند خدائی کے سامان موجود تھے مگر چونکہ دکن کا ملک وہ میدان تھا جس میں چچا کے عہد میں اس نے خود بڑے بڑے معرکے مارے ہوئے تھے، اس لئے اس کی یاد بھولی نہ تھی۔ چنانچہ اپنے بھائی کو ایک لشکر جرار دے کر روانہ کیا۔ اس نے جاتے ہی گجرات پٹن کو فتح کر راجہ کرن کو بھگا، تمام ملک دکن میں بھونچال ڈال دیا۔ فتح یاب آپ دیوگدھ کو چلا اور فتح نامہ شہنشاہ بھائی کو بھیجا۔ ساتھ اس کے دولت و مال تحائف بے مثال گھوڑے، ہاتھی، لونڈی، غلام اس قدر روانہ کئے کہ جن کی تفصیل سولے کاتبِ قدرت کے کسی دفتر میں نہ ہوگی۔ جب فتح نامہ پہنچا تو بادشاہ بہت خوش ہوا اور حکم دیا کہ باہر شہر کے شامیانے کھڑے ہوں۔ کل سر دربار ملاحظہ کریں گے۔ دوسرے دن دربارِ عام ہوا وزیر کے ہاتھ میں فرد تھی اور داروغہ ایک ایک چیز پیش کرتا تھا کہ ایک جھومر عورتوں کا سامنے لائے اور عرض کیا کہ یہ بھی بندی میں آئی ہیں۔ خانہ برباد دوں کی تباہی اور شکستہ حالی کا کیا پوچھنا مگر انہی میں ایک بی بی نظر آئی کہ اگرچہ اسی عالم میں ہے مگر سب عورتیں ادب کے ساتھ اسے بیچ میں لئے ہیں اور وہ بھی اپنے تئیں حیا کی چادر میں اس طرح چھپاتے ہے کہ

دیکھنے والے کی آنکھ خود بخود جھپک جاتی ہے۔ بادشاہ نے حیران ہو کر اس کا حال پوچھا۔ ایک سن رسیدہ عورت آگے بڑھ کر کچھ بولنے کو ہوئی مگر اسی بی بی نے چپکے سے ایسا کچھ کہا، بڑھیا خاموش ہو گئی۔ بادشاہ سمجھ گیا کہ یہ حیا والی پردہ نشین ضرور محلوں کی مسند نشین ہے۔ زمانے کی گردش نے یہ دن دکھایا ہے۔ اسی وقت خواجہ سرا کو حکم دیا کہ سب کو قید خانے میں، مگر اس بی بی کو عزت و حرمت سے حرم سرا میں لے جاؤ اور مفصل حال عرض کرو۔

جب خواجہ سرا حکم لے کر پہنچا تو اس حمیت والی نے کہا کہ مصیبت و ذلت کے وقت میں ان لوگوں نے میرا ساتھ نہ چھوڑا۔ میں عزت کے وقت میں انہیں چھوڑ دوں، ہمت اور حمیت سے بعید ہے۔ یہ سن کر بادشاہ اور بھی حیران ہوا اور تمام اہل دربار نے عورت کی ہمت پر آفریں کی۔ غرض اس کی بدولت سب بی بیاں عزت و حرمت سے حرم سرا میں داخل ہوئیں۔ بادشاہ نے محل کی سب بیگمات کو حکم دیا کہ جا کر اس سے ملیں اور دلداری اور خاطرداری کر کے حقیقت معلوم کریں۔ انجام کو یہ کھلا کہ وہ بی بی کولا دیوی نام راجہ کرن کی مہارانی ہے۔ باقی سب عورتیں امیروں اور وزیروں کی بی بیاں اور اس کی سہیلیاں ہیں۔

بادشاہ اس نیکبخت کی ہمت اور حمیت اور سلیقہ اور لیاقت کا قائل ہو گیا۔ اس وقت تو نہ بولا مگر کئی دن کے بعد حرم سرا کی بی بیوں کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ قضائے الٰہی سے جو ہونا تھا سو ہوا۔ اب اس محل کو اپنا محل سمجھو اور جس طرح وہاں کے راج میں رانی تھیں یہاں بادشاہ بیگم ہو کر حکمرانی کرو۔

رانی سنتے ہی آگ بگولا ہو گئی اور کہا کہ خبردار پھر یہ بات منہ سے نہ نکالنا۔ ننگ و ناموس کا مقدمہ ہے، قسمت جس طرح چاہے خاک میں ملائے مگر راجپوت کی مٹی سے یہ بے آبروئی کبھی نہ اٹھے گی۔ جان پر کھیل جانا کتنی بڑی بات ہے۔ مال صدقہ جان ہے اور جان حرمت پر قربان ہے۔ اگر بادشاہ نے ایسا ارادہ کیا تو دیکھ لو، ہیرے کی انگوٹھی میری انگلی میں ہے ایک کنی میں کام تمام ہوتا ہے۔ غرض یہ کہہ کر رانی نے اس طرح تیور بدلے کہ جو عورت پیام لائی تھی اپنا سا منہ لے کر چپ چلی آئی۔ یہ جواب سن کر بادشاہ تو ایسا مایوس ہوا کہ سب سلطنت کا کاروبار بھول گیا مگر وزیر کو یہ پتہ لگا کہ وہی سن رسیدہ عورت جو ساتھ ہے، اس نے رانی کو پالا ہے، اگر نکلے تو اسی کی معرفت کام نکلے۔ کئی باتمیز عورتوں کو سمجھا بجھا کر بھیجا چنانچہ وہ گئیں اور بڑھیا سے مل کر آمد و رفت کی راہ نکالی۔ دنیا کے لوگ جسے جادو طلسم کہتے ہیں وہ درحقیقت روپے کے حرفوں میں بند ہے۔ چنانچہ دو تین ہی دن میں اس نے

حامی بھرلی اور کہا کہ خیر بادشاہ سے کہدو، اتنا گھبراؤ نہیں۔ اگر دم میں دم ہے تو ایک دن رانی کو حضور کے پہلو میں لا بٹھاتی ہوں۔ اِدھر وقت بے وقت رانی کو سمجھانا شروع کیا اور ایک دن صاف صاف کہا کہ دھرم کی آن تو جاتی تھی سو جا چکی، اب پردہ ننگ و ناموس کا ہے تو اسی میں ہے جیسی پڑے ویسی بندہ سہے۔ آگے جو مرضی خدا کی غرض آہستہ آہستہ ایسے باغ سبز دکھائے کہ پری شیشے میں اتر آئی یعنی اس نے بھی منظور کر لیا۔ چنانچہ بادشاہ کی چچی دلہن کی ماں بنی اور بادشاہی ریت رسوم کے بموجب شاہانہ دھوم دھام سے دونوں کا بیاہ ہو گیا۔

پدمنی

رانی نے جوہر کرکے خاندان کی آن پر جان قربان کی

بادشاہ کے نام پر چچا کے خون کا دھبہ ایسا لگا تھا کہ اس کے مٹانے اور سب کا دل ہاتھ میں لانے کا بڑا خیال تھا۔ چنانچہ اس نظر سے اکثر عیش و عشرت کی محفلیں کرتا تھا اور ان جلسوں پر انعام و اکرام کے رنگ چڑھاتا تھا۔ اسی عالم میں کسی خوشامد خورے نے عرض کی کہ چتوڑ کے راجہ کے محلوں میں اگرچہ بہت سی رانیاں ہیں مگر ایک رانی پدمنی نام ہے کہ حسن و جمال میں دن کو مہر نیمروز اور رات کو ماہ تمام ہے۔ قاعدہ ہے کہ جوں جوں انسان بڈھا ہوتا ہے حرص جوان ہوتی ہے۔ بادشاہ یہ سنتے ہی مشتاق ہو گیا۔ لشکر کی تیاری کا حکم دیا اور خود فوج لے کر چتوڑ پر چلا۔ چند لڑائیوں کے بعد راجہ مقابلے کی تاب نہ لایا اور آخر کو قلعہ نشین ہوا۔ بادشاہ نے چاروں طرف فوجیں ڈال دیں اور سخت محاصرہ کر کے پیغام بھیجا کہ اب بھی اگر پدمنی کو شاہ محل میں داخل کر دو تو اسی وقت محاصرہ اٹھ جائے اور راج پاٹ بدستور قائم رہے۔ چنانچہ بہت سے پیغام سلاموں کے بعد یہ ٹھیری کہ بادشاہ خود قلعے میں جائے۔ پدمنی آئینے میں اپنی صورت دکھلائے اور صلح ہو جائے۔ علاؤالدین چند امیروں کو لے کر قلعہ میں گیا۔ راجہ نے بڑی عزت اور احترام سے ملاقات کی۔ دونوں تاجدار اکیلے بیٹھے۔ آئینہ آگے رکھا گیا اور وہ عالم تصویر گھونگٹ نکالے خنجر آبدار ہاتھ میں لئے پیچھے کر کھڑی ہوئی۔ اس کے یہ

معنی کہ اگر بادشاہ اس کے پکڑنے کا ارادہ کرے تو اسی وقت جان پر کھیل جائے۔ غرض اس کے جمال کو دیکھ کر بادشاہ آئینے کی طرح حیران رہ گیا بلکہ اشتیاق کا شعلہ ایسا بھڑکا کہ مہمان نے عہد و پیمان کو وہیں طاق پر رکھا اور مروت کے گھر کو آگ لگا دی۔ چونکہ راجہ کا اقبال منہ پھیر چکا تھا اور قید ہو کر دلی کا آب و دانہ کھانا تھا۔ تدبیر کی کوتاہی اور تقدیر کا پیچ ایسا پڑا کہ رانی تو نہ ہاتھ آئی مگر راجہ بے چارہ پھندے میں پھنس گیا۔ گھر اور گھرانا ویران ہو گیا اور رفیق لیگانے جنگل پہاڑ میں پریشان ہو گئے۔ بادشاہ اسے دلی میں لے آیا اور یہاں آکر پھر تشدد کیا کہ رانی کو منگا دو۔ قید بری بلا ہوتی ہے۔ ناچار بچارے نے منظور کر لیا اور جو جو قول کے پورے پہاڑوں میں اڑے بیٹھے تھے انہیں کہلا بھیجا۔ وہ سب سن کر پہلے بہت روئے اور کہا کہ خدا جانے راجہ کو کیا ہو گیا۔ راجپوت کا نام ڈبو دیا۔ پھر تجویز یہ ٹھہرائی کہ یہاں سے راجہ کے لئے مٹھائی اکثر جایا کرتی ہے اس میں زہر ملا کر بھیجدو کہ کام اس کا تمام ہو جائے اور ننگ و نام کے دامن پر داغ نہ آئے۔

راجہ کی ایک بیٹی بڑی عقلمند تھی۔ اس نے خاندان کے بزرگوں اور لشکر کے سرداروں کو جمع کیا اور کہا کہ اگر تم سب کے خیال میں آئے تو میری عقل میں ایک بات آئی ہے کہ خاندان کی بھی لاج رہ جائے اور راجہ کی جان پر بھی آنچ نہ آئے۔ صورت اس کی یہ ہے کہ یہی ٹوٹے پھوٹے نمک حلال جو ساتھ ہیں انہیں جمع کرو اور کہو کہ بھائیو اشرافت اور نمک کا حق ایک وقت پر دیکھا جاتا ہے۔ آج ایسا موقع آن پڑا ہے کہ جان سے گزر کر تمہارے راجہ کے ننگ و ناموس پر آن بنی ہے لیکن تم اگر ہمت کرو تو دونوں بچ جاتے ہیں اور تمہارے لئے بھی دو انجام ہیں کہ دونوں میں جیت تمہاری ہے یعنی آقا کو چھڑا لائے تو ملک و دولت تمہارا ہی مال ہے اور اگر مارے گئے تو نام تمہارے زمانے کے چہرے پر جوانمردی کا ٹیکہ ہو کر چمکیں گے۔ تدبیر اس کی یہ ہے کہ بہت سے سپاہی زنانے کپڑے پہن لو اور سلاحِ جنگ سنبھال کر پالکیوں میں بیٹھ جاؤ۔ مشہور یہ کرو کہ راجہ کا حکم آیا ہے اس لئے سب رانیاں دلی چلی ہیں۔ جب شہر کے پاس جاؤ تو ایسے موقع سے پہنچو کہ رات کو شہر میں داخل ہو۔ شہر میں گھستے ہی سیدھے قلعہ کا رخ کرو۔ اس وقت جان جوکھوں کے ساتھ پھرتی کا کام ہے کہ تلواریں سونت سونت کر قید خانے پر گر پڑو۔ مگر ایک گھوڑا بھی کسا کسایا ساتھ ہو کہ جس کا دم سو کوس سے کم نہ ہو۔ راجہ کو لو اور گھوڑے پر چڑھا ہوا ہو جاؤ۔

سب نے اس رائے کو پسند کیا۔ سولہ سو سُورما اور من چلے بہادر جنہوں نے عمریں دھاووں اور مار دھاڑوں میں گزاری تھیں، ڈولیوں میں بیٹھ کر روانہ ہوئے اور کہا کہ راجہ نے بلا لیا ہے۔ رانی جی سارے کنبے سمیت دلی چلی ہیں۔ بادشاہ نے یہ خبر سن کر اُدھر راجہ کی قید ہلکی کر دی، اُدھر رستے کے حاکموں کو لکھ بھیجا کہ حفاظت کے ساتھ کل سامان اور بار برداری ذمہ اپنا سمجھو۔ اور کمالِ عزت اور احتیاط کے ساتھ اپنی حد سے نکال کر دوسرے کے سپرد کر دو۔ الغرض منزل بمنزل سواریاں چلی جاتی تھیں۔ ہر پڑاؤ، ہر سرائے پر خیمے قناتیں کھڑی ہوتی تھیں۔ جگہ جگہ کے حاکم خود آن کر اہتمام کرتے تھے۔ اندر سے عورتیں نکلتی تھیں اور جو جو ضرورت ہوتی تھی لے جاتی تھیں۔ غیر صورت کا پرندہ تک قنات کے پاس نہ پھٹکنے پاتا تھا۔ اس طرح وہ پردہ نشین قافلہ دلی کے پاس پہنچا۔ جب شہر دو کوس رہا تو دو منزلہ کر کے دفعتہً رات ہی کو شہر میں داخل ہو گئے۔ غل پڑ گیا کہ رانی پدمنی کی سواری آ گئی۔ مگر پالکیاں قلعے کے نیچے پہنچتے ہی سارے راجپوت تلواریں گھسیٹ، ڈولیوں اور پالکیوں سے کود، بجلی کی طرح قید خانے پر جا گرے۔ جو سامنے آیا اسے مار گرایا اور راجہ کا طوقِ زنجیر توڑ گھوڑے پر چڑھایا۔ راجہ بھی اس طرح نکلا جیسے جنگلی طوطا جال سے نکلے۔ رستے میں کچھ سوار بیٹھے ہوئے تھے، سب نے گھوڑے چمکائے اور پارے کی طرح اُڑ گئے۔

یہاں بادشاہ خوش بیٹھا تھا جو یکایک غل اٹھا۔ کسی نے کہا چنگیزی مغل[1] آئے۔ کسی نے کہا ڈاکہ پڑا۔ اتنے میں خبر پہنچی کہ کل جو رانی کے آنے کی ہوائی اُڑی تھی وہ فقط بہانا تھا مطلب راجہ کا لے جانا تھا۔ کئی سو راجپوت آئے اور سپاہیانہ پیچ کھیل کر اپنے راجہ کو نکال لے گئے۔ یہ سنتے ہی بادشاہ کے ہوش اُڑ گئے، حکم دیا کہ پر لگا کر اُڑ کر جاؤ، جس طرح ہو اُسے پکڑ لاؤ، غول کے غول سواروں کے گئے۔ کئی جگہ تلوار بھی چلی، مگر راجہ لڑتا بھڑتا پہاڑوں میں گھس اپنے ٹھکانے جا ہی پہنچا۔ کوئی دن وہاں بیٹھ کر ہاتھ پاؤں سنبھالے۔ چند روز کے بعد پھر گھر یاد آیا۔ پرچے پیغام دوڑانے شروع کیے۔ باپ دادا کی رعیت کو پھیر لینا کتنی بڑی بات تھی آیا اور ملک پر قابض ہو گیا۔

یہاں بادشاہ کے دل کو قرار کہاں تھا۔ ایک تو آیا ہوا ملک ہاتھ سے گیا، دوسرے راجہ اس طرح ڈنکے کی چوٹ قلعے میں سے نکل گیا اور سب سے زیادہ یہ کہ پدمنی کی لگن لگی ہوئی تھی غرض پھر فوج لے کر آپ پہنچا اور جاتے ہی چاروں طرف سے شہر کو گھیر لیا۔

---

۱ اس زمانے میں ۲۰۔۳۰۔۴۰ ہزار تاتاری مغل کابل کشمیر ڈیرہ جات کی گھاٹیوں سے اتر کر اکثر یہاں لوٹ مار کر جاتے تھے۔

راجہ نے بھی باہر نکل کر خوب خوب مقابلے کئے۔ جان ہاروں نے ملک کے نام پر جانیں قربان کیں، مگر کہاں تمام ہندوستان کا تاجدار کہاں چتوڑ کا باج گزار۔ جوان جوان بیٹے آنکھوں کے سامنے مارے گئے۔ بڑے بڑے سردار کٹ گئے۔ جب سب طرح سے آس ٹوٹ گئی تو ایک بیٹا باقی تھا اسے بلا کر کہا کہ لے فرزند جو کچھ یہاں ہم پر گزرے گی آثار اس کے نمودار ہیں اب بہتر یہی ہے کہ تم یہاں سے کسی طرف کو نکل جاؤ کہ نسل تو قائم رہے۔ بعد اس کے پدمنی کو سامنے بلایا اور دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ ہر چند کہ وہ عورت تھی مگر بڑی معنی شناس تھی۔ اس نے اُسی وقت صندل کی لکڑیاں منگا کر سات چتائیں چنوائیں۔ تمام خاندان کی عورتیں اور بڑے بڑے ٹھاکروں اور سرداروں کی بی بیاں جو خاوند اور خاندان کے نام کے آگے جان کو کچھ مال نہ سمجھتی تھیں سب آئیں۔ سر سے پاؤں تک چادریں اوڑھے گھونگھٹ نکلے، پھولوں کی ایک ایک مالا گلے میں، رام رام کی سمرن کرتی چتاؤں کے گرد کھڑی ہوئیں اور خلقت کا ہجوم ہو گیا۔

جس وقت چتاؤں کو آگ دی اور شعلے بلند ہوئے، دلوں سے دھوئیں اور خلائق سے ایک غل اٹھا۔ ہر ستونتی لاج کی ماری ایک ایک سے آگے بڑھتی تھی۔ اپنی آبرو اور مردوں کی فتح کی دعا کرتی تھی اور پروانے کی طرح اس بھڑکتی آگ پر گر کر آن کی آن میں جل مرتی تھی۔

جب اس ہمت مردانہ سے کہ جس پر ہزار ہزار جوان مردوں کو صدقہ کر ڈالئے، عورتوں نے یہ ساکھا کیا تو سب کا دل زندگی سے بیزار ہو گیا۔ راجہ رہے سہے رفیقوں کو لے کر اوّل قلعے کے میدان میں کھڑا ہوا۔ دل غم سے پانی پانی تھا اور نگاہوں سے خون ٹپکتا تھا مگر نہ آنکھ سے آنسو نکلتا تھا نہ منہ سے بات نکلتی تھی۔ بھائی بھائی سے اور باپ بیٹے سے رخصت ہوا۔ سب سے آگے راجہ اور پیچھے تمام جان نثار جن میں سپاہی اور سردار، سب برابر ہو رہے تھے قلعے سے باگیں اٹھائے نکلے اور ان گنتی کی جانوں کو گھوڑی کر کے لشکر شاہی کے دریا میں دے مارا۔ اگرچہ دیکھنے والوں کے نزدیک ان کی وہ حالت ہوئی کہ کوئی ایک مٹھی خاک کی طوفانِ نوح میں پھینک دے مگر اہل نظر جانتے ہیں کہ جب تک چاند سورج باقی ہیں ان مردوں کے نام آسمان مردانگی پر آفتاب مہتاب ہو کر چمکیں گے۔

جب میدانِ جنگ کا اس طرح خاتمہ ہوا تو بادشاہ فوراً قلعے میں پہنچا اور جاتے پوچھا کہ پدمنی کا محل کونسا ہے، چند عورتیں ایک راکھ کے ڈھیر پہ کھڑی رو رہی تھیں، انہوں نے

ایک مٹھی خاکستر اُڑا کر دکھائی اور چیخیں مار مار کر رونے لگیں۔ اُس وقت بادشاہ سے سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا تھا کہ افسوس کرتا ہُوا نکل آیا اور دارالخلافہ کو مراجعت کی۔

خضر خاں اور دیول دیوی

اگرچہ علاؤالدین بادشاہ کے محلوں میں کولا دیوی بادشاہ بیگم تھی، دنیا کی نعمتیں موجود اور عیش و عشرت کا گلشن ہمیشہ بہار پر تھا، مگر کولا دیوی کے دل کا کنول کملایا ہی رہتا تھا۔ بادشاہ پوچھتا تو کچھ بتاتی نہ تھی۔ اتفاقاً چند روز کے بعد بادشاہ نے پھر دکن پر فوج کشی کا حکم دیا اور کولا دیوی نے بھی سنا جب بادشاہ محل میں آئے تو عرض کی کہ جہاں پناہ حضور کے اقبال سے آج میں ملک ہندوستان کی ملکہ ہوں اور جدھر دیکھتی ہوں مرادوں کا چمن لہلہا رہا ہے مگر ایک کانٹا غم کا ہے کہ دل میں کھٹکتا ہے۔ چونکہ اس کے نکالنے میں ملکوں کی تباہی اور ہزاروں بندگانِ خدا کا خون بہتا نظر آتا تھا اس لئے کہنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ اب یہ صورت خدا ساز پیش آئی ہے اس لئے عرض کرتی ہوں کہ جب میں راجہ کرن کے محلوں میں راج کرتی تھی تو خدا نے دو بیٹیاں عنایت کی تھیں کہ ہر ایک حُسن و جمال کے سانچے میں پُتلی کی طرح ڈھلی تھی۔ ایک تو خورد سالی ہی مر گئی تھی، دوسری جس کا دیول دیوی نام ہے زندہ و سلامت موجود ہے۔ اُس کی آنچ سے دل سینے میں مچھلی کی طرح تڑپتا ہے۔ اگر وہ کسی طرح صحیح و سلامت آئے تو آنکھوں کو سُکھ کلیجے کو ٹھنڈک آجائے۔ بادشاہ نے کہا یہ کتنی بڑی بات ہے۔ اُسی وقت سپہ سالاروں کے نام حکم بھیجا کہ راجہ کرن جو ملک دکن میں آوارہ ہے اسے دیول دیوی کے لئے پیغام بھیجو اور خواہ صلح خواہ لڑائی جس طرح ہوسکے اس طرف روانہ کرو۔

طرفہ ماجرا یہ ہوا کہ جب یہ ذکر ہو رہا تھا تو خضر خاں بادشاہ کا بیٹا بھی حاضر تھا۔ اس کے حسن و جمال کی تعریف سن کر دل میں عشق غائبانہ کے نور نے ایسا جلوہ دکھایا کہ ایک جان سے ہزار جان عاشق ہو گیا۔ وہاں تو مارے شرم کے کچھ نہ کہہ سکا مگر سپہ سالاروں کو خود ایک خط روانہ کیا۔ جب انہوں نے فرمانِ شاہی کے ساتھ ولیعہد کا خط بھی دیکھا تو ایک کی جگہ دہ چند خیال ہو گیا۔

یلغار کرتے ہوئے اُڑے اور دکن کی حد میں پہنچتے ہی فوج کے دو حصے ہو کر راجہ کرن پر گرے۔ اس نے بھی دو مہینے تک دونوں طرف خوب میدان کئے۔ اتفاق تقدیر کا دیکھو کہ دیوگڈھ کے راجہ کا بیٹا بھی دیول دیوی پر عاشق تھا مگر وہ قوم کا مرہٹا تھا اور راجہ کرن کہ اصل راجپوت تھا اسے مرہٹا ذات کا بیٹا سمجھ کر بیٹی دینے کو راضی نہ ہوتا تھا۔ اب جو فوج شاہی سے یہ معاملہ آن پڑا تو اس نے بھی سب خبریں سنیں۔ بھیم دیو نے اپنے چھوٹے بھائی کو تحفہ تحائف دے کر پیغام بھیجا کہ ترکوں اور ہندوؤں میں جو دن رات کا فرق ہے آپ پر ظاہر ہے۔ اگر اب بھی شفقتِ بزرگانہ سے آپ فرزندی میں قبول فرمائیں تو ان ترکوں کی ترکی تمام کر دینی کچھ بڑی بات نہیں۔ راجہ کرن ایسے نازک وقت میں مصلحت یہی سمجھا کہ فوراً دیول دیوی کو اس کے ساتھ دیوگڈھ کو بھیج دیا۔ اِدھر بادشاہی لشکر میں خبردار نے خبر پہنچائی کہ پری کو دیو لے اُڑا۔ سپہ سالار نے اسی وقت سرداروں کو جمع کر کے کہا کہ اگر دیول دیوی ہاتھ سے گئی تو پھر یہ منہ دربار کے دکھانے کے قابل نہ رہے گا۔ آج ہمت کے بازوؤں میں جتنا زور ہے سب لگا دو اور دیول دیوی کو جانے نہ دو۔ سب نے اس رائے پر اتفاق کیا۔ اسی وقت تین تین دن کا کھانا پانی کمروں سے باندھ جانوں سے ہاتھ دھو پہاڑ میں گھسے۔ نہ دن دیکھا نہ رات۔ تیسرے دن نور کا تڑکا تھا اور راجہ کا لشکر ابھی بستروں پر تھا کہ ترکی اور تازی گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں کانوں میں پہنچیں۔ راجپوت بھی جس حال میں تھے ایسے چمک کر اٹھے جیسے پتھر سے شرارہ یا سپند اور انگارہ ——— اگاڑی پچھاڑی تلواروں سے کاٹ ننگی پیٹھوں پر چڑھ بیٹھے۔ پیادے کو ہوش نہ تھا کہ ہاتھ میں تلوار ہے یا کٹار ہے۔ سوار کو خبر نہ تھی کہ سیدھا ہے یا الٹا گھوڑے پر سوار ہے۔ غرض کہ صبح سے لے کر تین پہر تک برابر تلوار چلی۔ کیا ترک کیا راجپوت دونو ہار گئے مگر ولایتی شمشیر والوں نے راجپوتی کھانڈوں کے منہ پھیر دیئے۔ راجہ کرن نے سیدھا دیوگڈھ کا رخ کیا۔ فتح یابوں نے سیکڑوں ہاتھی ہزاروں گھوڑے لاکھوں کے خزانے اور جواہرات لوٹے مگر وہ گوہر شب چراغ نہ ہاتھ آیا جس کے لئے رانی کے محل اور ولیعہد کی آنکھوں میں دنیا اندھیر تھی۔ جان نثار سپہ سالار کو بادشاہ کے حکم اور ولی عہد کی بات کا خیال تھا جب دیول دیوی کو نہ پایا بہت گھبرایا۔ ٹھیرنا مناسب نہ جانا۔ جنگل اور پہاڑ میں برابر تین دن تک بجلی کی طرح کڑکتا اور بادل کی طرح برستا چلا گیا۔ جب دیوگڈھ ایک دن کے رستے پر رہا تو ایک تالاب نظر آیا۔

اور نا امید ہو کر کنارے اُتر پڑا۔

اتفاقاً فوج کے جوان جوان بہادر جمع ہو کر سپہ سالار کے پاس آئے اور کہا کہ تقدیر سے یہاں آنا ہو گیا ہے نہیں تو ہم کجا؟ اور یہ جنگل پہاڑ کجا؟ دنیا دیکھنے کے لئے ہے آخر مرجانا ہے۔ پہلو میں کوہ آلورا کے قدیمی غار ہیں اور ان میں کسی زمانے کی عمارتیں ہیں جن کی دستکاریاں دیکھ کر صنعتِ الٰہی یاد آتی ہے۔ اگر اجازت ہو تو جا کر دیکھ آئیں۔ سپہ سالار نے کہا جاؤ مگر دائیں بائیں سے ذرا ہشیار جانا کہ دشمن کا گھر ہے اور ہر قدم پر خطر ہے۔ غرض چند سردار اور کئی سو آدمی لشکر سے گئے۔ اب قدرتِ الٰہی کا تماشا دیکھو کہ یہ سب ہلتے بولتے آگے پیچھے چلے جاتے تھے جو دیکھا ایک سامنے کچھ سوار نظر آئے۔ یہ گھبرائے کہ شاید دشمن دیوگڈھ سے مدد لے کر پھر پلٹا چنانچہ اپنی جمعیت کو ترتیب دیا اور سب سنبھل کر دفعتہً جا پڑے۔ ان بیچاروں کی حقیقت کیا تھی۔ ایک حملے میں تتر بتر ہو گئے۔ ادھر سے انہوں نے نوچ کھسوٹ مار دھاڑ شروع کر دی ایک سپاہی کو پینس نظر آئی کہ کہار رکھ کر بھاگ گئے ہیں اور چند مرہٹنیں ہتھیار بند آس پاس کھڑی ہیں۔ یہ للکار کر پہنچا اور تلوار کھینچ کر کہا کہ نکل آ اور نکال جو کچھ پاس ہے۔ ایک لونڈی گھبرا کر چلائی کہ خبردار ہاتھ نہ اٹھانا۔ جس کے لئے ہزاروں آدمی کے لہو پانی ہو کر بہہ گئے وہ گوہر مقصود اسی میں ہے۔ یعنی دیول دیوی کا سکھ پال ہے۔ یہ سنتے ہی سب دوڑے آئے اور ہاتھوں ہاتھ سکھ پال اٹھا سپہ سالار کی خدمت میں لا حاضر کیا۔ اسی وقت ایک عرضی بادشاہ کو دوسری مبارکباد ولی عہد کو لکھ کر گھڑ بہل میں دیول دیوی کو بٹھایا اور ایک دستہ دو اسپہ سواروں کا ساتھ کر کے کمال حفاظت کے ساتھ دلی کو روانہ کر دیا۔ سواروں کو تاب کہاں تھی۔ منزل کو دو منزلہ اور دو منزلہ کو سہ منزلہ کرتے، دوڑا دوڑ اور بھاگا بھاگ اس طرح آئے گویا قلعے کے نیچے ہی کھڑے تھے۔ بادشاہ یہاں بے خبر محلوں میں بیٹھے تھے۔ شاہزادہ منہ لپیٹے چھپر کھٹ میں پڑا تھا۔ یا تو پرچہ نویسوں کی تحریر سے معلوم ہوا تھا کہ فتح ہو گئی ہے مگر راجہ نے دیول دیوی کو دیوگڈھ بھیج دیا ہے یا دفعتہً اُردا بیگنی نے خبر دی کہ قبلۂ عالم رانی جی کا سکھ پال خاص ڈیوڑھی پر دھرا ہے۔ بادشاہ مارے خوشی کے باغ باغ ہو گیا۔ اسی وقت سر سے شال کھول اس کے سر پر ڈال دی۔ ولیعہد چھپر کھٹ میں پڑا تھا۔ وزیر زادہ دوڑا آیا اور کہا کہ لو میاں پروانے اٹھو تمہاری شمع نے آ کر محل کو روشن کر دیا۔ سنتے ہی حیران ہو گیا۔ جب وزیر زادے نے قسم کھا کر کہا

تو اٹھ کر اس کی پیشانی چوم لی اور کلاہ جواہر نگار جس پر ہما کے پروں کی کلغی لگی تھی تکیے پر سے اُٹھا اس کے سر پر رکھ دی۔ ماں بے اختیار ہو کر دوڑی۔ بیٹی کو اتروایا اور دیر تک گلے لگا کر رویا کی۔ بعد اس کے اندر لا کر مسند پر بٹھایا مگر منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ گویا دو چینی کی مورتیں تھیں کہ آمنے سامنے دھری تھیں۔ ہاں آنسوؤں کے تار جاری تھے اور دلوں پر ہزاروں خیال گزر رہے تھے کہ کیا تھا اور کیا ہو گیا۔

غرض تھوڑی دیر کے بعد ماں بیٹی میں کچھ باتیں ہو کر دیول دیوی کو غسل کروایا۔ محل کی ساری بی بیوں نے آکر مبارک باد دی۔ مگر اب ولی عہد کو تاب کہاں تھی ؟ باپ سے کچھ نہ کہہ سکا۔ وزیر کے پاس پیغام دوڑانے شروع کئے۔ وزیر نے بادشاہ سے عرض کی۔ بادشاہ نے کہا کہ میں کیا کہوں، اس لڑکی کے ماں باپ جو کچھ سمجھو رانی ہے۔ اس سے پوچھنا چاہیے۔ رانی پہلے تو بہت حیران ہوئی اور کہا کہ مسلمانوں کا نرالا دستور ہے۔ بھلا میں حضور کی خدمت میں تو میری بیٹی حضور کے بیٹے سے کیونکر منسوب ہو سکتی ہے ؟ بادشاہ ہنسے اور کہا کہ یہ مسئلہ شریعت کا ہے۔ جب ان دونوں کے باپ جدا جدا ہیں، ماں جدا جدا ہیں، تو پھر شادی کا کیا مضائقہ ہے۔ رانی کو کیا عذر تھا وہ راضی ہو گئی۔ غرض تجویز یہ ٹھیری کہ وزیر دلہن کا باپ بنے دولہا برات لے کر اس کے گھر جائے اور رسم شاہانہ سے دلہن بیاہ لائے۔ اسی وقت تمام شہر میں آئینہ بندی کا حکم ہو گیا۔ نوبت خانے پر ٹکور پڑی۔ گھر گھر میں طبلہ کھڑکنے لگا۔ بادشاہی باورچی خانے گرم ہو گئے اور حکم ہوا کہ چالیس دن تک کسی گھر میں کھانے پکانے کا دھواں نہ اٹھے۔ اس طرح شبھ لگن مبارک ساعت دیکھ کر صبح ہوتے گل کا بلبل سے عقد ہوا اور دن کو دلہن بیاہ لائے۔ ان دونوں کا عشق ایسا عالم آشوب ہوا کہ ہندی فارسی کے شاعروں نے قصے جوڑے اور کہانیاں بنائیں۔ سینکڑوں برس گزرے اب تک لوگ ان کے گیت گاتے ہیں۔

—٭—

ظہیرالدین بابر بادشاہ

کہتے ہیں کہ ملک فرغانہ میں عمر شیخ نام ایک بادشاہ تھا۔ جو چوتھی پشت میں امیر تیمور کا پوتا تھا۔ قضائے الٰہی سے دفعتہً مرگیا۔ بابر اُس کا بیٹا بارہ برس کا تھا۔ باپ کے مرنے سے تخت و تاج کا بار یکبار سر پر آپڑا۔ اگرچہ تخت نے پاؤں چومے اور تاج سر پر قربان ہوا مگر چچا، اور ماموں، بھائی اور ہمشیر کی یادگار سے شمشیر کے ساتھ پیش آئے اور جب خورد سال بادشاہ کی ہوا بگڑی دیکھی تو اندر باہر بہت سے دشمن کھڑے ہو گئے۔ یہ ہمت والا سب کو جواب دیتا رہا۔ بہت دفعہ گرا اور بہت دفعہ سنبھلا مگر جب شیبانی نام ایک اُزبک دشت خفچاق سے اٹھ کر تمام بخارا اور سمرقند پر چھا گیا اور باپ کے ملک میں نمک حرام نوکروں نے دم نہ لینے دیا تو اس کی بھی آس ٹوٹ گئی۔ چنانچہ آخری مصیبت کی کہانی یہ ہے کہ جب میدانِ جنگ کو چھوڑا تو بیس آدمی اس کے ہمراہ تھے۔ دشمن کے سوار پیچھے تھے اور یہ گھوڑے مارے چلے جاتے تھے۔ جب پھر کر دیکھتے ان کا غبار پیچھے ہی دکھائی دیتا۔ ناچار پھر بھاگ نکلتے۔ آخر گھوڑوں کے دم ٹوٹنے لگے اور نوبت یہ ہوئی کہ جس باوفا کے گھوڑے میں ذرا دم ہوتا وہ اپنا گھوڑا انہیں دے دیتا اور ان کی گرد کو حسرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوا رستے سے کٹ کر کسی گاؤں میں چلا جاتا۔ اخیر کو ایک بابر اور ایک اُس کا کوکہ[۱] رہ گیا۔ جب چلتے چلتے اس کا گھوڑا بھی ہار گیا تو بابر نے بھی اپنی لگام روکی۔ اس نے کہا کہ آپ میرا ساتھ کیوں دیتے ہیں۔ آگے بڑھ جائیے۔ شاید آپ کی جان بچ جائے۔ بابر نے آبدیدہ ہو کر کہا کہ تجھے اس حال میں چھوڑ کر کہاں جاؤں۔ ایک بچھونے میں پرورش پائی اچھا ہے کہ دونوں کے مُردے بھی ایک ہی جگہ پڑے پائیں۔ غرض کہ کوکہ دُعا دے کر رخصت ہوا اور بابر آگے چلا۔ تھوڑی ہی دُور گیا تھا جو دو سوار پیچھے نظر آئے مگر ان کے گھوڑوں میں بھی جان نہ رہی تھی۔ جب وہ تیر کی زد پر پہنچے تو سامنے پہاڑ تھا۔ بابر نے چاہا کہ تیر مارتا ہوا اوپر چڑھ جائے۔ ترکش کی طرف دیکھا تو انیس تیر تھے۔ دل قوی ہو گیا اور آگے بڑھا۔ جب آفتاب غروب ہونے لگا

---

[۱] یعنی جس کی ماں کا بابر نے دُودھ پیا تھا ۱۲

تو انہوں نے آواز دی کہ اس طرح آپ کہاں تک جائیں گے۔ بھائی تو پکڑے گئے آپ بھی چلے آیئے۔ یہ سن کر بہت فکر ہؤا مگر جواب کچھ نہ دیا اور آگے بڑھے گیا۔ وہ بھی گھوڑوں سے اتر لئے اور اب عذر خواہی کے طور پر کچھ کچھ سمجھاتے ہوئے چلے کہ پھر چلنا مناسب ہے۔ بابر نے کہا کہ پھرنا تو اب ممکن نہیں لیکن تم اگر خدمت کرنی چاہو تو البتہ یہ ایسا وقت ہے کہ عمر بھر نہ پاؤ گے۔ بات فقط اتنی ہے کہ مجھے ایسے رستے پر ڈال دو جہاں سے میں اپنے ماموؤں میں جا پہنچوں اور تمہیں وہ کچھ دوں کہ تمہاری آرزو سے زیادہ ہو۔ اگر یہ نہیں تو جس رستے آئے ہو پھر جاؤ جو میری قسمت میں ہونا ہے ہو رہے گا۔ انہوں نے کہا کہ اس طرح آپ کو چھوڑ کہاں جائیں کاش کہ ہم نہ آتے۔ خیر اُدھر آپ نہیں چلتے تو جہاں چلئے ہم خدمت کو حاضر ہیں۔ چنانچہ قسمیں کھا کر ساتھ ہو لئے مگر اس نے انہیں آگے رکھا اور آپ پیچھے ہؤا۔ جب نکاس کی جگہ پر پہنچے تو نابکاروں نے دھوکہ دیا اور اندھیرے میں کہیں کے کہیں لے کر نکل گئے۔ غرض رات بھر پہاڑوں میں ٹکراتے، ٹھوکریں کھاتے پچھلا پہر تھا جو ایک آبادی کے پاس پہنچے۔ تینوں تھک کر چور ہو گئے تھے اور جاڑا بھی سخت تھا۔ بابر وہاں ٹھیرا اور ان سے کہا کہ صبح قریب ہے کسی ایسے ویران گوشے میں چل کر دن گزارو جہاں کوئی ہمارے حال سے خبردار نہ ہو۔ ایک بولا کہ گھوڑے آٹھ پہر سے بھوکے ہیں میں دانہ تو لاؤں یہ کہا اور گاؤں میں چلا گیا۔ یہاں صبح ہوتی تھی اور بابر کا رنگ فق ہوتا تھا۔ جب دن نکلا تو فقط تین روٹیاں ہاتھ میں لئے آیا۔ انہوں نے گھبرا کر ایک ایک روٹی بغل میں رکھ لی اور ایک پشتے پر چڑھے کہ اس کے پیچھے دن گزاریں۔ سرسبز زمین میں گھوڑے چھوڑ دیئے اور تینوں تین پشتوں پر بیٹھ کر پہرا دینے لگے۔ بابر دُور سے لوگوں کو آتا جاتا دیکھتا تھا مگر وہم کے مارے کسی کے بلانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ شام ہوئی تو انہوں نے صلاح دی کہ شہر میں ایک باغ سب سے الگ ہے اس میں چل بیٹھیں تو بہتر ہے چنانچہ وہاں جا کر ایک ٹوٹا سا مکان پڑا تھا وہیں بیٹھ گئے۔ ایک ان میں سے گیا، پرانا سا پوستین اور ارزن[1] کی آش[2] لایا اگرچہ گلے میں اٹکتی تھی اور منہ کو کڑوی لگتی تھی مگر خوب گرم گرم تھی، وہ پی کر اور

---

[1] ایک غلہ ہے جیسے باجرا مگر لوچ اس میں اتنا بھی نہیں ہوتا۔ اسی واسطے گلے میں اٹکتا ہے بلکہ ایک قسم کی بُو اور تلخی اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے ۱۲۔

[2] آش گویا ہندوستان کا ہریرہ ہوتا ہے مگر نمکین ۱۲

پوستین اوڑھ کر عجب لطف حاصل ہوا لکڑیاں جلا کر سینکنے لگے اور بابر درخت سے کمر لگا کر ذرا سو گیا

حقیقت میں ان بدذاتوں نے گاؤں کے ملک[1] سے سازش کر کے اُسے غنیم کے پاس بھیجدیا تھا۔ یہاں اس کی خاطر جمع کر کے بیٹھنے کی صلاح دی اور آپ کوٹھے پر جا کر پہرا دینے لگے۔ دفعتہً ایک آیا اور کہا کہ فلاں سردار آتا ہے۔ بابر بہت گھبرایا اور کہا جا کر دیکھ تو سہی یوں ہی آیا ہے یا میرے سراغ پر آیا ہے۔ وہ گیا اور آکر کہا کہ آپ ہی کے پاس آیا ہے۔ پوچھا کس ارادے سے؟ کہا کہ آپ کے نوکر ہیں ارادہ کیا کریں گے۔ لے جائیں گے تو بادشاہ بنائیں گے، آپ ڈرتے نہیں۔ اتنے میں وہ آیا۔ تسلیم کر کے بیٹھ گیا اور ایسی باتیں سنائیں کہ بابر کو تردد ہوا۔ مگر پھر بھی اپنے تئیں سنبھالا اور اس سے کہا کہ مرنے سے تو میں نہیں ڈرتا مگر تجھے خدا کی قسم سچ کہہ اگر کچھ اور صورت ہو تو میں وضو کر لوں کہ اخیر وقت خدا کے سامنے باطہارت تو جاؤں۔ سردار مذکور نے بار بار قسمیں کھائیں۔ تب بابر نے اسے بٹھایا اور آپ اٹھ کر باغ کے کونے کی طرف گیا۔ دل میں کہا کہ مرنا تو برحق ہے مگر ہاتھ پاؤں چلتے ہیں تو انہیں ہلانا چاہیئے۔ اسی وقت دیوار پھاند سیدھا بیابان کا رستہ لیا اور خراسان کی طرف رخ کیا۔ آبادی سے بچتا اور رستے سے کٹتا چلا جاتا تھا۔ رات ہوتی تو درخت کے نیچے پڑ رہتا تھا۔ صبح کو چل کھڑا ہوتا۔ پہلی منزل میں بغل کی روٹی نے رفاقت کی۔ دوسری میں جنگل کے گھاس پات نے ضیافت کی۔ تیسرے دن ایک گاؤں میں پہنچا اور توکل بخدا اندر داخل ہوا۔ اتفاقاً وہاں کسی زمانے کے اپنے چند نوکر بھی آئے ہوئے پڑے تھے۔ سب نے آکر قدم لئے اور اوُر لوگوں کو خبر کی۔ پہاڑی نیک نیت بڑی محبت اور مہمان نوازی سے پیش آئے۔ غرض یہاں بیٹھ کر دم لیا۔ کپڑے دھلوا کر پہنے اور یہ پہلی دفعہ تھی کہ چہرے پر خط نے اصلاح پائی۔ چنانچہ اسی وقت اپنی تُوزک میں تحریر کیا۔ چند آدمیوں کو اِدھر اُدھر بھیجا کہ جو اور نمک خوار کھنڈے ہوئے ملیں انہیں سمیٹیں۔ ماں تباہی زدہ بھی اسی طرف آنکلی تھی۔ چنانچہ جب دو سو آدمی سے زیادہ جمع ہو گیا اور اُس چھوٹے سے گاؤں میں گنجائش نہ رہی تو دل نے کہا کہ جس مٹی میں کھیل کود کر بڑا ہوا اب قسمت کا آب و دانہ وہاں نہیں۔ مصلحت یہی ہے کہ پانچ پشت کی میراث سے ہاتھ اٹھا کر باپ دادا کے ملک کو خدا حافظ کہو اور اپنی قسمت جیحون پار چل کر آزماؤ۔ اس وقت

---

[1] ملک وہاں ایسا ہوتا ہے جیسے یہاں اعلے ذیلدار ۱۲

اپنی عمر ۲۳ برس کی تھی اور ان مصیبتوں کی عمر ۱۱ برس کی ہوئی تھی۔ مگر وزن کرو تو عمروں کے لیئے بہت ہیں۔ غرض ہزار جبر و تقبیل سے کابل کو روانہ ہوا۔ فوج کی جمعیت دیکھو تو جیسے لٹا بنجارا، شمار میں دو سو سے زیادہ مگر سب پیادے۔ ٹوٹے پھوٹے موزے گھٹنوں تک چڑھے، کندھوں پہ لاٹھیاں، سامان میں دو چادر خیمے تھے کہ ایک میں ماں اترتی تھی ایک کے نیچے آپ بیٹھ جاتا تھا۔

کابل میں اس کے چچا کو مار کر اور رشتہ داروں کو اندھا کر کے خسرو نام ایک نمک حرام وزیر خسرو شاہ بن بیٹھا تھا۔ جب بابر پہنچا تو اس کا نام سنتے ہی تمام ولایت میں غلغلہ ہو گیا اور لوگ اٹھ اٹھ کر آنے لگے۔ بلخ کی حد سے آگے بڑھے تو یہ عالم ہوا کہ خسرو کا دربار ٹوٹنے لگا۔ آخر اس نے بہت عذر و معذرت کے ساتھ پیغام بھیجا کہ ملک حضور کا اور حضور کے بزرگوں کا ہے۔ میری جاں بخشی اور اسباب ضروری کی اجازت ہو جائے۔ چنانچہ وہ اُدھر سے سامان شاہی کے ساتھ آیا۔ یہ اپنے قلندروں کے ساتھ جہاں اترے تھے وہاں سے اٹھ کر ایک چنار کے درخت کے نیچے جا بیٹھے۔ خسرو خود پیشکش لے کر حاضر ہوا اور قدیمانہ طور سے آداب و تسلیمات کے ساتھ نذرانہ پیش کیا۔ وہ تو نذر دے کر رخصت ہوا اور یہ اٹھ کر اپنے خیمے میں آئے مگر اسی وقت سب خورد و کلاں اس طرح اُٹھ کر اس کے لشکر میں آ گئے گویا اُدھر کی دُنیا اِدھر ہو گئی، بڈھا وزیر جو برسوں سے لڑکوں کی اتالیقی میں بادشاہی کرتا تھا، اکیلا رہ گیا۔ اور یہ یا تو ان حالوں سے آیا تھا یا بیس تیس ہزار لشکر مسلح سے بنے بنائے دربار میں بادشاہِ افغانستان بن کر بیٹھ گیا۔ غرض منزل بمنزل کابل پر آئے۔ حاکم وہاں کا ایک دو دن اٹکا، پر اب ذرا ان کا ستارہ بھی چمک گیا تھا، معافی کے وعدہ پر شہر خالی کر دیا۔ قلعے میں آ کر دربار کیا۔ ضلع ضلع کے سردار حاضر ہوئے، مگر خزانے اور توشہ خانے سب خالی پڑے تھے۔ فقط دلاسا اور تسلی دے کر سب کو رخصت کیا اور سلطنت کے کاروبار جاری کر دیئے۔

اب گویا تاتاری خانہ برباد کو افغانستان میں گھر ملا۔ نہیں۔ نصیب کی گردشوں نے نقل مکان کیا کیونکہ اِدھر ترکوں اور مغلوں کی مصیبت تھی اُدھر افغانوں کی آفت سامنے ہوئی۔ اپنی کوئی جمعیت ساتھ نہ تھی جس پر بھروسا ہو۔ بھائی قوتِ بازو تھا تو وہ تھا کہ برسوں غنیم کے ساتھ رہ کر منہ پر تلواریں مار چکا تھا۔ وطن سے تو کچھ واسطہ ہی نہ تھا۔

ہاں اُدھر سے دشمنوں کے پیچھا کرنے کا کھٹکا ضرور لگا ہوا تھا۔ مگر وہ ہی حوصلے والا تھا کہ پہاڑوں سے ہمت آزماتا تھا اور کیا ہزارے کیا افغان دونوں سے ٹکراتا تھا۔ اضلاعِ کابل کے قدرتی گلزار گویا باغِ بہشت کے نقشے تھے۔ ان میں پھر کر چپہ چپہ زمین کو دیکھا، ہر قسم کی پیداوار، ہر ایک میوہ، ایک ایک چرند اور پرند کا حال اپنی توزک میں ذخیرہ کیا۔ درختوں کا جھومنا، سبزے کا لہلہانا، نہروں کا لہرانا، سرو شمشاد کی چھاؤں میں بیٹھنا، ہری ہری گھاس پر لوٹنا، غرض کسی بات کا لطف باقی نہ چھوڑا اور انہی دنوں میں خطِ بابری بھی ایجاد کیا۔ اس کی طبیعت خدا نے ایسی شگفتہ بنائی تھی کہ جس حال میں ہو، دل کو خوش رکھتا تھا۔ چنانچہ اسی عالم میں جس گلزار یا سبز پہاڑ میں گزر ہوتا مصاحبوں کو لے کر بیٹھ جاتا۔ کبھی عالمِ آب کی سیر کرتا۔ کشتی آہستہ آہستہ چلی جاتی ہے، آپ غزلیں کہتا ہے، رباب بجواتا ہے اور تر کی ترانے سنتا جاتا ہے۔ باغ تو جابجا لگائے مگر کابل کے برابر دامنِ کوہ میں ایک باغ ایسا لگایا کہ لاہور کا شالامار گویا ایک ناتمام اس کی نقل ہے۔ نو درجے تک برابر گلزار، چشموں سے نہریں اور نہروں سے قدرتی آبشار جاری۔ سب سے اُوپر کے درجے میں ایک مکان دلفزا بنایا کہ اس میں بیٹھ کر جہاں تک نظر کام کرے گل اور لالہ ہی نظر آتا ہے۔

بابر کا چچا سلطان حسین بائقرا، خراسان کا بادشاہِ عالی شان تھا۔ اس کو خبر پہنچی کہ شیبانی خان نے اب ادھر کا رخ کیا۔ سلطان نے جابجا اسلئے بھیجے اور بابر کو بھی بلایا مگر اسی عرصے میں وہ مر گیا۔ اس کے بارہ بیٹے تھے۔ سب وہاں جمع ہوئے اور اسے پھر طلب کیا۔ اوّل تو شیبانی خاں کا خوف، دوسرے سنتا تھا کہ ہرات کو چچا نے خوب آراستہ کیا ہے۔ اس لئے روانہ ہوا۔ اس نے جا کر چچا کا پُرسہ دیا۔ بھائی بھی بڑی محبت سے پیش آئے۔ ایک ایک نے جدا جدا ضیافت کی اور چنگیزی رسمیں جن کو اب تک اپنا دستور العمل سمجھتے تھے، سب عمل میں لائے۔ بابر نے تمام شہر اور عمارات کو دیکھا اور ایک ایک مکان اور وہاں کی ایک ایک صحبت کا حال اپنے توزک میں لکھا۔ اس عرصے میں برف پڑنے لگی اور ڈاک بند ہو گئی۔ چونکہ اسے گھر کا فکر لگا ہوا تھا اس لئے جس طرح ہوا رخصت ہو کر ادھر روانہ ہوا۔ مگر رستے میں ایسی تکلیفیں پیش آئیں کہ آج تک کسی سفر میں نہ دیکھی تھیں۔ زمین آسمان برف ہی نظر آتے تھے اور جہاں گھوڑے قدم رکھتے تھے، زین تک غرق ہو جاتے تھے۔ تیس سوار سے زیادہ ساتھ نہ تھے، ان میں بھی مارے سردی کے، نہ کسی کے ہاتھ پاؤں میں دم تھا نہ سر میں

ہوش و حواس بجا تھے۔ ناچار خود گھوڑے سے کود پڑا۔ اس کے ساتھ اور وفاداروں کو بھی کودنا پڑا۔ اور برف کو کوٹتے آگے رستہ بناتے چلے۔ اب مشکل یہ ہوئی کہ برف نے سارے اتے پتے چھپا دیئے تھے اس لئے رستہ بنانے والا خود رستہ بھول گیا۔ ایسے پہاڑوں میں جا پڑے کہ آبادی کا تو کیا ذکر ہے کوئی قافلہ بھی وہاں نہ گزرا ہوگا۔ اسی حالت میں شام ہو گئی۔ سب حیران اور ڈر یہ تھا کہ اگر پہاڑ کے اوپر سے برف[1] لڑھکی تو سب کے سب اس طرح دبیں گے کہ برسوں تک کسی کو خبر نہ ہوگی۔ جب چلتے چلتے اندھیرا ہو گیا تو ایک جگہ اُتر پڑے اور اپنے ہاتھ سے گردن گردن تک برف ہٹا کر زمین نکالی کہ بستر کر کے رات بسر کریں۔ ایک مصاحب نے آکر خبر دی کہ پہلو میں ایک طاق سا نظر آتا ہے آپ اس میں چل بیٹھیں کہ سر پر سایہ تو ہو۔ بابر نے کہا جو سب کا حال سو اپنا حال؛ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اتنے میں دوسرا آیا اور کہا کہ جسے طاق سمجھتے تھے وہ بڑا غار ہے اور اس میں تیس چالیس آدمی بہ آرام رہ سکتے ہیں چنانچہ سب نے اندر جا کر بستر کئے اور خود جیبوں سے گوشت نکال کر وہیں ایک دیگ چڑھا دی۔ شوربے میں خشک روٹیاں ڈبو کر دو دو پیالے سب نے پئے اور گرم ہو کر خدا کا شکر ادا کیا۔ تمام رات چائے کی پیالیاں پی کر کاٹی۔ صبح کو روانہ ہوئے اور اسی طرح مرتے دکھ بھرتے بامیان تک آئے۔

وہاں آکر اسی برف باری میں ہزارے کے وحشیوں سے مقابلے ہو رہے تھے، جو خبر آئی کہ ایک بھائی کابل میں بادشاہ ہو گیا اور مشہور کر دیا کہ آپ ہرات میں قید ہو گئے مگر اب تک ایک نمک حلال بالا[2] حصار کا قلعہ روکے ہوئے اڑا ہوا ہے۔ بابر بہت گھبرایا۔ رفیقوں کو ترکستان کی مصیبتیں یاد آگئیں اُس نے اسی وقت ایک جاسوس قلعہ دار کے پاس بھیجا کہ خاطر جمع رکھنا ہم آ پہنچے۔ جس وقت تم کو معلوم ہو جائے کہ ہم دو تین کوس پر پہنچ گئے تو قلعے کے برج پر آگ جلا کر روشنی کرنا کہ ہم سمجھ جائیں اور خود باہر نکل پڑنا۔ چنانچہ اسی طرح عمل میں آیا اور یہ کوچہ و بازار کو کشت و خون سے لال کر کے قلعے میں داخل ہوا۔ بھائی بیوفا بھی گرفتار ہوا اور تلوار و ترکش جو مارنے کو کمر سے باندھے تھے، گلے میں ڈال کر چنگیزی رسم کے موجب دربار میں آیا۔ مگر بابر ذرا آنکھ پر میل نہ لایا۔ دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور کہا آؤ بھائی گلے تو ملو۔ وہ بدستور دو جگہ تسلیم کو جھکا مگر ایسا شرمایا ہوا تھا کہ اُلجھ کر دو دفعہ گرا۔ اس نے پہلو میں بٹھایا اور اس کے لئے شربت منگایا۔ جب آیا تو پہلے دو گھونٹ اس میں سے

[1] برفانی پہاڑوں میں جب چوٹیوں پر بہت سی برف جمع ہو جاتی ہے تو دفعتاً وہاں سے نیچے گرتی ہے، اوپر تو ایسی آواز ہوتی ہے گویا کئی توپیں برابر داغ دیں اور نیچے قافلے بلکہ گاؤں کے گاؤں دب جاتے ہیں۔ [2] کابل کے قلعہ کا نام بالا حصار ہے۔

آپ پی لئے، پھر پلایا کہ اسے وہم نہ آئے۔ بابر نے اب تک شراب نہ پی تھی۔ ہرات کی ضیافتوں میں بھائیوں نے بہت منتیں کیں۔ وہاں تو شرماتا ہی رہا مگر یہاں آکر عمر بھر کا بدلا نکالا۔ کوئی قطعہ زمین کا ایسا نہ چھوڑا جہاں بیٹھ کر اس کا لطف نہ اٹھایا ہو۔ مصاحبوں کے جلسے جماتا شراب پیتا۔ نہ ملتی تو معجون ہی کھا کر خوش مستیاں کرتا۔ وہی باغ نوبہار جس کے چند درجے اب تک بھی باقی ہیں، اس میں ایک خوشنما حوض سنگِ مرمر کا بنوایا۔ اسے شراب انگوری سے بھرتا، مصاحبوں کو لے کر بے تکلف بیٹھتا اور وقت کو مزے سے گزارتا۔ حوض مذکور کے کنارے پر یہ شعر آبدار لکھا تھا۔ ؎

نوروز و نوبہار و می و دلربا خوش ست
بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

ایک دفعہ دورہ کرتا ہوا غزنی میں جا نکلا۔ پرانی پرانی عمارتوں کو دیکھ کر اور مزاروں پر جا کر زیارتیں کیں۔ لوگوں نے کہا "یہاں ایک مزار ایسا ہے کہ جب اس پر کچھ پڑھتے ہیں تو ہلنے لگتا ہے" چنانچہ خود جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ فقط خادموں کی دوکانداری ہے اور کچھ نہیں۔ چنانچہ انہیں بلا کر خوب دھمکایا۔

اکثر کتابوں میں لکھا ہے کہ نواحِ غزنی میں ایک چشمہ ہے جب اس میں کچھ نجاست پڑ جاتی ہے تو بے انتہا برف آسمان سے گرنے لگتی ہے۔ چنانچہ اسے بھی تلاش کیا۔ کہیں پتہ نہ لگا۔ چند روز کے بعد وطن کی کشش نے پھر بغل میں گدگدی کی، یعنے شیبانی خاں جس نے سمرقند اور بخارا سے تیمور کا نام مٹایا تھا وہ جوشِ مذہبی میں آکر جہاد کے بہانے شاہِ ایران سے جا بھڑا اور لڑائی ہی میں مارا گیا۔ بابر کی بہن کسی لڑائی میں اس کے ساتھ آئی تھی، اب وہ بندی میں گرفتار ہوئی۔ شاہ نے اسے بڑی عزت سے بابر کے پاس بھجوا دیا۔ انہیں راہ پیدا کرنے کو اتنا سہارا بہت ہوا، دو دفعہ شاہ سے مدد لے کر ایسی بازیاں اٹھائیں کہ گویا بخارا ہی میں بیٹھے تھے مگر قسمت میں سیب سمرقندی اور انگور بخارائی نہ تھے۔ ہندوستان کا دانا پانی لکھا تھا۔ چنانچہ دشمنوں نے رعایا کو بھڑکا دیا کہ بابر شیعوں کی مدد لے کر آیا ہے اس کا نکالنا واجب ہے۔ یہ بغاوت ایسی آندھی کی طرح اٹھی کہ ننگے سر ننگے پاؤں جان لے کر وہاں سے بھاگا اور کابل میں آکر دم لیا۔

بابر سے بھی مسند پر بیٹھ کر کھانا ہضم نہ ہوتا تھا چار دفعہ ہندوستان آیا اور ہر بار قدم

آگے ہی بڑھایا مگر پانچویں دفعہ ایسا آیا کہ پھر جنازہ ہی یہاں سے پھرا۔ ہاں اولاد کے لئے پشتوں تک سلطنت قائم کر گیا۔ چنانچہ پنجاب کو صاف کرتا ہوا دلی پر چلا۔ ادھر سے ابراہیم لودھی ایک لاکھ فوج اور ایک ہزار ہاتھی جنگی لے کر اس دھوم دھام سے نکلا گویا ہندوستان کی آرائش اور تین پشت کی شانِ شاہانہ کو نکال باہر ڈال دیا۔ بابر جب یلغار سے فتح و ظفر کا غبار اڑاتا پانی پت پر پہنچا تو ایک میدان وسیع نظر آیا۔ اِدھر اُدھر گھوڑا مار کر نشیب و فراز سردارانِ لشکر کو دکھایا بعد اس کے سبزہ زمین پر گاڑ گھوڑے سے کود پڑا اور حکم دیا کہ یہیں ڈیرے ڈال دو۔ دوسرے دن صبح کو اٹھ کر نوطوغیں[1] اور نشان سامنے لشکر کے کھڑے کئے۔ تمام سرداران کے نیچے آ کر جمع ہوئے۔ ایک نشان آپ لیا باقی اوروں نے لئے۔ چند سردار اُن کے پھریرے تان کر کھڑے ہوئے اور تاتاری رسم کے بموجب اسی زبان میں کچھ منتر پڑھے۔ بعد اس کے فوج کو آراستہ کر کے کمان[2] سے ناپا تو لشکرِ جرار بارہ ہزار شمار میں آیا۔ چنانچہ شہر پانی پت کو دلہنے ہاتھ پر رکھا۔ شاہ قلی توپچی اپنی رومی قواعد کام میں لایا یعنے چمڑے کے رسوں سے توپوں کا زنجیرہ بنایا اور بوروں کے مورچے باندھ، سلامت کوچے اور خندقیں کھود لیں۔ رات کو شبخون بھیجا مگر حریف کی فوج چھ کوس تک برابر پڑی ہوئی تھی، جلتے جلتے صبح ہو گئی۔ شبخون پورا نہ پڑا۔ دوسرے دن صبح ہوتے خبردار نے خبر دی کہ دشمن نے اپنے دریائے لشکر کو جنبش دی ہے۔ بابر شیر کی طرح انگڑائی لے کر بستر سے اُٹھا، ہتھیار سجے اور فوج کو مرتب کر کے سامنے کیا۔ توپیں تو جہاں کھڑی تھیں وہاں سے ہل ہی نہ سکتی تھیں۔ بے ٹھکانے گولے مارنے شروع کر دیئے اور ترکانِ تاتاری نے دائیں بائیں سے رگڑ کر زور دیا۔ حریف کا لشکر جب آگے بڑھا تھا تو ایسا معلوم ہوا تھا کہ دریا چڑھا چلا آتا ہے مگر جب اس نے کوئی طرف دبتی نہ دیکھی تو تھم گیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا سوچتا ہے کہ بڑھوں یا نہ بڑھوں۔ ٹھیروں یا ہٹ جاؤں۔ بابر نے دفعتہً حملے کا حکم دیا۔ بارہ ہزار ترکِ خونخوار اور سوارِ جرار اس دریا میں مچھلیوں کی طرح تیرنے لگے۔ اس طرح کی قیامت برپا ہوئی کہ جس سے نجات کے لئے چالیس ہزار جان ہاروں کے ساتھ خود ابراہیم کو جان قربانی میں دینی پڑی۔ سپاہی اس کے بھاگتے پھرتے تھے اور ترک تلواروں سے مارتے

---

[1] طوغ ایک قسم کا نشان ترکوں کے لشکر میں ہوتا ہے اور یہ عمل بھی وہ لوگ شگون کے طور پر کرتے ہیں ۱۲

[2] اس وقت چنگیزی آئین کے بموجب فوج کے شمار کا یہی قاعدہ چلا آتا تھا ۱۲

پھرتے تھے۔ ایک سردار شمشیر بکف کسی کھنڈر میں جا نکلا۔ دیکھا کہ کئی سو کشتے اور زخمی کٹے پڑے ہیں مگر سب سردار اور منصب دار معلوم ہوتے ہیں۔ انہی میں تاجدارِ ہند بھی بے تاج بے کلاہ مرا پڑا تھا۔ خدا کی قدرت ہے، وہ میدان جس میں صبح تک "ابراہیم ابراہیم" کا نقارہ بجتا تھا، خیمے، سراچے، سراپردے کھڑے تھے، نشان لہراتے تھے، بازار لگتے تھے۔ دوپہر تک ٹہوکا میدان ہو گیا اور زمین و آسمان سے "بابر بابر" کی صدا آنے لگی۔ جنہوں نے رستمی اور اسفندیاری کے دعووں سے تلواریں باندھی تھیں، سب فنا ہو گئے اور جو بچے بھیس بدل بدل کر نکل گئے۔ فتح یاب نے ہمایوں ولی عہد کو مع چند سرداروں کے آگرے روانہ کیا اور آپ دلّی میں آیا۔ قدیمی عمارتوں کو دیکھا، درگاہوں کو سلام کیا اور بادرفتار سے اُتر کر آبی سواری میں بیٹھا کہ دریا کی راہ آرام سے آگرے پہنچے۔ ابراہیم کے اہل و عیال مع خزانے کے وہیں تھے اور گوالیار کا راجہ قلعہ دار تھا کہ سو برس سے پشت بہ پشت راجہ چلا آتا تھا، مگر وہ رفیق پرست میدانِ جنگ میں سر کے ساتھ رفاقت کا حق گردن سے اُتار چکا تھا۔ چنانچہ ہمایوں بے تکلف قلعے میں داخل ہوا۔ ستارہ اقبال کا چڑھا ہوا تھا اور دل شیر سے کئی میدان آگے بڑھا ہوا تھا۔ فوراً دروازوں کا بندوبست کر، فوج فصیلوں پر پھیلا دی۔ ابراہیم کی ماں دیرینہ سال بھی زندہ تھی۔ اس نے جب دیکھا کہ حریف کا بیٹا قلعے میں آ گیا تو ایک دم حیرت کا عالم رہا۔ آخر کچھ نہ بن آئی۔ شرم و حیا کے برقع کو پھاڑ چادر سر پر ڈالی اور حرم سرا سے نکلی۔ آگے آگے دو خواجہ سرا، پیچھے پیچھے چند یتیم بچے اور بیوہ لاوارثیں۔ جگر غم سے داغ داغ اور زبانیں ضبط سے چاک چاک۔ دلوں میں آہیں مگر منہ سے دعائیں دیتی شاہزادے کے سامنے آئی اور کہا کہ "اے فرزندِ اقبال بلند۔ اس چراغِ سحری کی دعا لے اور باپ دولتمند کی سلامتی میں ان بیواؤں اور یتیموں کی جاں بخشی کر۔" سعادت مند شہزادہ انقلابِ فلک کو دیکھ کر کانپ گیا اور دنیا کی بے وفائی آئینہ ہو گئی۔ بہت خاطر جمع کی اور اشارہ کیا کہ انہیں حرم سرا میں لے جاؤ۔ اس سن رسیدہ بی بی نے تھرتھراتا ہاتھ چادر سے نکال کر صندل کی ڈبیا میں ایک الماس گراں بہا دیا اور کہا "نورِ چشم بکرماجیت کے وقت سے اس گوہرِ شب چراغ کے شہرے نے عالم کو روشن کر رکھا تھا۔ علاؤ الدین کے عہد سے شاہانِ اسلام کے خزانے میں آیا۔ تین پشت تک ہم نے بھی امانت داری کی۔ وہ آج ہی کے لئے تھی۔ اب یہ تمہارا حق ہے۔" غرض ہمایوں انہیں عزت و حرمت سے بٹھا کر آپ خزانوں

کی طرف متوجہ ہوا۔ ابراہیم کو روپیہ سمیٹنے کا شوق بڑا تھا اور اسی سبب سے فوج اور رعیت پریشان بے سامان رہتی تھی۔ چنانچہ خزانوں کو دیکھا تو بھرے پائے۔ سب کا بندوبست کر کے باپ کی خدمت میں آیا۔ سارا حال عرض کیا اور الماس نذر دے کر انعام میں لیا۔ دریا دل بادشاہوں کا قاعدہ ہے کہ زورِ تیغ سے لیتے ہیں اور بے دریغ دیتے ہیں۔ بابر نے خزانوں میں سے کئی کئی لاکھ نقد اور انواع و اقسام کے تحفے ایک ایک بیٹے اور ہر ایک سردار کو دیئے۔ لشکر میں ترک، افغان، ہزارے، عرب، بلوچ فرقے فرقے کے لوگ تھے، سب کو نہال کر دیا۔ بخارا اور سمرقند میں اپنے خاندانی مشائخوں کو عجیب و غریب تحفے بھیجے۔ کابل کی رعایا میں بچے بچے تک ایک ایک شاہرخی[1] بٹی۔ بعد اس کے دفتروں پر متوجہ ہوا اور بندوبست کے ساتھ خانۂ سلطنت کی آرائشیں کرنے لگا۔ ہندوستان کے حالات اور پیداواروں اور صنعتوں کی تحقیقاتیں شروع کیں۔ عمارتوں کو دیکھا اور خود ایسے باغ لگائے اور مکانات اور حمام بنائے کہ ہندوستانی آ کر دیکھتے اور کہتے کہ آگرہ بھی کابل قندھار ہو گیا۔ یہاں کے لوگ سمجھتے تھے کہ جس طرح محمود اور تیمور آندھی کی طرح آئے اور بگولے کی طرح چلے گئے، اسی طرح بابر بھی چلا جائے گا۔ جب اس کا جماؤ دیکھا تو اُدے پور کا رانا جس کے خاندان میں صدہا سال سے راج چلا آتا تھا، اس نے بہت سے ہندو مسلمان سرداروں کو سمیٹ کر لاکھ آدمی کا جتھا جمع کیا کہ اس ترک بچے کو مار نکال دو۔ بابر نے رفیقوں کو بلا کر گفتگو شروع کی۔ چنانچہ پہلی تجویز یہ ٹھہری کہ جو جو یہاں کے لوگ فوج میں شامل ہوئے ہیں انہیں اضلاع میں بھیج دینا چاہیئے تاکہ میدان میں عین وقت پر دغا نہ کریں۔ بعد اس کے سرداروں نے کہا کہ اپنی کمی اور غنیم کی زیادتی ظاہر ہے، اس لئے مناسب ہے کہ آپ پنجاب میں جا کر عنایتِ الٰہی کے منتظر رہیں، جاں نثار میدان گرم کریں، اگر فتح پائی تو حضور دولت و اقبال کو رکاب میں لے کر تشریف لائیں اور اگر ہم شہادت سے سرخرو ہوئے تو پنجاب سے کابل تک کا ملک حضور کو مبارک رہے۔ اس ہمت والے نے کہا کہ اے میرے رفیقو! جو فتح تم نے کی ہے اس کی عالم میں دھوم مچ گئی ہے۔ مگر اس حرکت کو سن کر ملک ملک کے بادشاہ یہی کہیں گے کہ اتنا بڑا ملک لے کر یہ خزانے اور جواہرات مارے اور جب تلوار مارنے کا وقت آیا

۱؎ ایک سکہ تھا جو شاہرخ مرزا' امیر تیمور کے بیٹے کے نام سے شاہرخی کہلاتا تھا اور مقدار میں سات آنے کے قریب ہوتا تھا۔ ۱۲

تو سرداروں کو آگے رکھ کر آپ سرک گیا۔ تیمور و چنگیز کے نام پر داغ لگنے سے مرجانا ہزار درجے بہتر ہے۔ جبراب جو تمہارا حال سو میرا حال۔ یہ سن کر تمام سرداروں نے دعا دی اور فوج مع توپ خانے کے روانہ ہوئی۔ فتح پور سیکری کے پاس یہ پرچا لگا کہ دشمن بھی بڑھا چلا آتا ہے اور ہراول کی فوجوں کی ٹکر ہو گئی۔ بادشاہ یہ خبر سنتے ہی خود دبا گیں اٹھایا چاہتا تھا جو خبر آئی کہ میدان اپنے ہاتھ رہا۔ غرض جس ڈھنگ سے ابراہیم لودھی کی لڑائی میں لشکر اترا تھا اسی طرح یہاں اتارا۔ مگر شام کو جب فوج کی موجودات لی تو معلوم ہوا کہ سپاہ کے دل بجھے ہوئے ہیں۔ اسی وقت سرداروں کو میدان میں بلایا اور ایک پُر تاثیر تقریر اس طرح ادا کی کہ اے غریب الوطن بادشاہ کے رفیقو، تم دیکھتے ہو کہ ہم کون ہیں اور کہاں کھڑے ہیں۔ برسوں محنت کی، مدتوں مصیبت سہی، اپنی جان خطروں میں ڈالی، پیارے رفیقوں کی جانیں دیں، تب نامرد دشمنوں کو زیر کیا۔ اور وہ ملک تم نے لیا کہ روئے زمین کے سلاطین اس کی آرزو کرتے ہیں۔ بہادرو دیکھتا ہوں کہ تمہارے دل گھٹے جاتے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ جمعیت کے گھٹنے کا مضائقہ نہیں مگر دلوں کا گھٹنا غضب ہے۔ خدا نہ کرے کہ ذرا بھی ہوا پلٹے، پھر زمین و آسمان میں ٹھکانا نہیں۔ دیکھو تیموری تلوار جس نے یہاں تک پہنچایا وہ تمہارے ہاتھ میں ہے، پھر خطرہ کس بات میں ہے۔ ہاں وہ بات نہ ہو کہ بے وفائی سے رُوسیاہی کے دفتر میں نام لکھا جائے اور ہڈیاں سب کی یہاں خاک ہوں۔ دیکھو آخر مرنا اوّل مرنا، پھر مرنے سے کیا ڈرنا۔ مگر تلوار مار کر مرنا ہزار زندگی سے بہتر ہے۔ جینا انہی لوگوں کا ہے جو آقا کے نمک اور بازوؤں کے زور پر لڑے اور مردوں کے دفتر میں نام لکھوا کر خدا کے سامنے سرخرُو گئے۔ لو اب یہ قرآن شریف تمہارے سامنے ہے۔ تم جانو اور یہ جانے۔ قرآن کو دیکھتے ہی سب نے سر جھکا دیئے، چہرے سرخ ہو گئے اور بہتوں کے آنسو نکل پڑے۔ دوڑ دوڑ کر اس پر سر رکھ دئے اور ہاتھ رکھ رکھ کر کہا کہ جب تک دم میں دم ہے جو بادشاہ سے پھرے خدا اور کلام خدا سے پھرے۔ غرض سب کے دل قوی ہو گئے اور ہنسی خوشی اپنے اپنے خیموں میں آ گئے۔ نیا نکتہ یہ نکلا کہ شراب انگوری خاص کابل سے منگائی تھی، وہ دو دن پہلے پہنچی تھی چونکہ ہمایوں کو شراب سے نفرت تھی، اسے بڑی منتوں سے پلائی تھی۔ اس موقع پر فتح کی منت مان کر توبہ کی اور تمام سونے چاندی کے باسن تڑوا کر نام خدا دے دئے۔ چند ترکی شعر توبہ کے مضمون میں کہے اور آگرے میں

بجائے شراب خانے کے تعمیرِ مسجد کا حکم بھیج دیا۔ ساتھ ہی مسلمانوں کے کُل محصول معاف کر کے تمام گناہوں سے، یہاں تک کہ داڑھی منڈانے سے بھی توبہ کی۔ مگر شیطان نے ایک شوشہ چھوڑا یعنے وطن سے کوئی نحوست زدہ نجومی پہنچا۔ اس نے تمام لشکر میں ہل چل ڈال دی کہ اس لڑائی میں ہماری شکست ہوگی۔ لوگ تو بہت گھبرائے مگر بادشاہ نے کچھ پروا نہ کی اور صبحدم ابھی مشرق سے علمِ آفتاب بلند نہ ہوا تھا کہ اس نے پھریرا علم کا میدان میں کھول دیا۔ پہلے ہی توپوں کے منہ سے بسم اللہ ہوئی۔ سامنا سامنے قائم رہا اور ترک غول کے غول جدا ہو ہو کر چاروں طرف سے گرنے لگے۔ غنیم نے بھی مردانگی کی داد دی، مگر دوپہر سے اس کا طور بے طور ہونے لگا۔ بابر نے دفعتہً نقارہ فتح کا بجا کر ایسا حملہ کیا کہ سب کے قدم اُکھڑ گئے۔ دُور تک بھاگتوں کا پیچھا کیا۔ شام کو پھرے اور غنیم کے خیمہ گاہ اور لشکر کے بازاروں کو دیکھتے ہوئے رات کو اپنے ڈیروں میں پہنچے۔ ہواخواہ آتے تھے اور مبارکبادیں دیتے تھے۔ آغا نجومی بھی شرمندہ صورت آئے۔ بابر نے بہت سی گالیاں دیں، مگر چونکہ نمک خوار قدیمی تھا، اس لئے لاکھ ٹنکہ دے کر حکم دیا کہ ابھی لشکر سے نکل جائے۔ وہاں ایک مینار یادگار بنایا اور فتح کا نقارہ بجاتا، اقبال کا نشان اُڑاتا گوالیار میں آیا۔ پتھر کا ہاتھی اور شمس الدین التمش کی مسجد دیکھی اور اس فتح سے فرمانوں میں بادشاہِ غازی تحریر ہونے لگا۔

بابر بادشاہ جیسا مزاج کا رنگین تھا ویسا ہی دل کا سخت اور طبیعت کا مصیبت پسند تھا۔ کئی دفعہ کالپی سے گھوڑا اُڑایا اور ایک سو ساٹھ میل زمین طے کر کے دوسرے دن آگرے میں دم لیا۔ کشتیاں موجود ہوتیں اور گنگا جیسے دریا پر کپڑے اتار ننگی تلوار ہاتھ میں لے کر کود پڑتا۔ تیر کر پار اتر جاتا اور حریف پر دھاوا مارتا۔ آخر کوچ کے دن نزدیک آئے اور بیمار ہو کر طبیعت بے اعتدال ہوئی۔ اتفاق یہ کہ انہی دنوں میں ہمایوں بھی سخت بیمار ہوا۔ حکیم طبیب سب نے اپنی اپنی حکمت خرچ کی مگر کسی سے کچھ نہ ہوا۔ آخر مشائخوں اور بزرگوں کو بلا کر پوچھا۔ انہوں نے عرض کی کہ جو چیز حضور کی نظر میں نہایت گرانبہا ہو وہ نورِ چشم پر نثار کیجئے کہ اس کی آئی بلا ٹلے۔ بابر سمجھ گیا کہ یہ ابراہیم لودھی والے الماس کا اشارہ ہے۔ کہا کہ پتھر کیا مال ہے۔ لختِ جگر پر میں اپنا گوہرِ جان قربان کروں گا۔ یہ کہہ کر اُٹھا تین بار گرد پھرا اور کہا کہ الٰہی اس کی بلائیں نے اپنی جان پہ لے لی، لے لی۔ بعد اس کے سجدہ کیا اور یہ تک

رو رو کر دعا مانگتا رہا۔ خدا کی قدرت کہ اُسی وقت سے اُس کا مرض گھٹنے لگا اور اِس کا بڑھنے لگا۔ بیٹے سے کہا کہ تخت تمہیں مبارک ہو۔ ہمارے لئے حکم دو کہ تختۂ تابوت تیار کریں۔ آخر بیٹا بستر بیماری سے اٹھ کھڑا ہوا اور باپ نے بستر عدم پر آرام کیا۔ تاریخ ہوئی کہ ع
ہمایوں بود وارث ملک وی۔ لاش کابل میں بھیجی گئی۔ چنانچہ جہانگیر نے اس پر ایسا عالی شان مقبرہ بنوایا کہ اب بھی سیاح لوگ اسے دنیا کی بے نظیر عمارتوں میں شمار کرتے ہیں۔

اُس وقت تک امیر تیمور کی اولاد میں جو بادشاہ ہوئے، امیر کی رعایت سے امیرزا کہلاتے تھے۔ بابر نے ہندوستان مار کر اپنے نام پر امیرالمومنین کا تاج رکھا اور شاہی کا تمغا لگایا:۔

نصیرالدین ہمایوں

جب ہمایوں کے سر پر ہمائے سلطنت نے سایہ ڈالا تو جشن شاہانہ سے جہان کو روشن کیا اور اتنے خوان اور کشتیاں بھر بھر کر انعام دئے کہ تخت نشینی کی تاریخ کشتی زر ہوگئی۔ بہادری اور قابلیت کے ساتھ دل کا رحیم اور ہاتھ کا سخی ایسا تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ جو جو ملک بھائیوں نے مانگے اس نے ہنسی خوشی دے دیئے۔ خطا بخشی کا یہ عالم تھا کہ اپنے تو در کنار دشمن بھی جب کُشت و خون سے دل کی ہوس نکال کر عذر کرتے تو معاف ہی کر دیتا۔ چند روز کے بعد ملک گیری کو اُٹھا۔ دکن کی مہموں میں فتح کے نشان اڑاتا پھرتا تھا جو پرچہ لگا کہ فرید افغان شیر خاں بن کر بنگالہ کی طرف حملے کر رہا ہے۔ چنانچہ خود فوج لے کر ادھر آیا اور شیر کے پنجے سے اپنے شکار چھڑانے لگا۔ مگر اس ملک کی سرسبزی اور برسات کی بہار سے آرام طلبی ایسی غالب ہوئی کہ گوڑ[1] کا نام جنت آباد رکھ کر خود عیش و عشرت میں مست ہو بیٹھا۔ لشکر کچھ تو سفر کے مارے ٹوٹ گیا تھا۔ یہاں بنگالہ کی برسات اور ہوا کے بگاڑ نے انسان حیوان سب کو گرا دیا۔ چاروں طرف نالے دریا چڑھ کر خبریں بھی بند ہوگئیں اور جا بجا فساد

[1] قدیم زمانے میں بنگالہ کا دارالخلافہ تھا ۱۲

ہونے لگے۔ ادھر ایک بھائی آگرے میں آیا اور ایک اُدھر کو بڑھا۔ شیر خاں اور بھی شیر ہوگیا اور اس نے بھی ادھر کا رخ کیا۔ بادشاہ کو یا تو خبر نہ تھی، ہوئی تو سب باتوں کی ایک دفعہ ہی خبر ہوئی۔ فوج کو دیکھا کہ شکستہ حال بلکہ شکستہ دل پایا۔ چنانچہ برسات کے بعد رستہ کھلتے ہی فوج کے بہادر بھاگنے لگے۔ اس نے بھائیوں کو لکھا کہ جو ملک باپ نے بڑی بڑی جانیں کھپا کر لیا تھا آپس کے جھگڑوں میں مفت ہاتھ سے جاتا ہے۔ شیر خاں بُری بلا ہے۔ پہلے سب مل کر اس کا فیصلہ کر لو۔ پھر تمہاری خوشی سے مجھے کسی طرح انکار نہیں۔

کوتہ اندیش بھائیوں نے شفیق بھائی کی کچھ نہ سنی۔ ناچار گھر کی خبر لینی واجب سمجھ کر پہلے آگرے کو چلا۔ رستے میں دیکھے تو ایک ایک نالہ دریا اور ہر دریا سمندر ہو رہا ہے۔ ہاتھی اور اونٹوں کو باربرداری تو درکنار اپنی جان کا اٹھانا بھی وبال ہو گیا۔ غرض مع لشکر سفر کے دریا میں تیرتا چلا آتا تھا کہ شیر خاں کو خبر لگی وہ سنتے ہی شیر کی طرح جھپٹا اور نہنگ کی طرح ندی نالوں سے اترا۔ فوج اس کی جو دن رات یلغاروں پر چڑھی ہوئی تھی اس طرح باگیں اٹھائے آئی کہ ہمایوں کو رستے ہی میں آن لیا۔ امیروں نے بادشاہ کو صلاح دی کہ حریف برابر دو منزلہ اور سہ منزلہ کرتا ہوا آیا ہے آج ہی اس پر جا پڑیں تو بہتر ہے مگر بادشاہ کے خیال میں نہ آیا۔ شیر خاں نے راتوں رات کھائیاں اور مورچے تیار کئے۔ دوسرے دن جو اُسے دیکھا تو قلعے میں بیٹھا پایا۔ ناچار یہ صلاح ٹھیری کہ ادھر کشتیاں جمع کرتے رہیں اور لڑائی کو ٹالتے رہیں، جب موقع پائیں تو پار اتر جائیں۔ شیر خاں بھی کچھ فوج اور کچھ سامان کے انتظار میں تھا وہ غنیمت سمجھا اور اس عرصے میں دو مہینے گزار دیئے۔ بعد اس کے یہ پیچ کھیلا کہ ایک دن خیمہ ڈیروں سے لشکر کا چہرہ درست رکھا اور خود ایک فوج جرار لے، پانچ سات کوس کا چکر دے بادشاہ کے پیچھے آ پڑا۔ اور اپنے پیر کو نامہ دے کر یہ پیغام بھیجا کہ اگر حضور بنگالہ کا ملک مجھے دیں تو آگے کی طمع نہ کروں اور سکہ خطبہ حضور کا قائم رکھوں۔ بادشاہ اس وقت میں یہی غنیمت سمجھا اور قرآن پر مہریں ہو کر عہد و پیمان ہو گئے۔ لیکن آج تو قسما قسمی کر کے خاطر جمع کی، دوسرے دن قرآن کو مع عہد و پیمان طاق پر رکھ۔ فوج کے تین حصے کئے۔ عین صبح کا وقت تھا جو تلواریں کھینچ اس طرح آن پڑا کہ بادشاہ اور سارا لشکر حیران رہ گیا۔ اس وقت سوائے گریز کے کوئی رستہ نظر نہ آیا اور جدھر جس کا منہ اٹھا اُدھر بھاگا۔ لاکھوں کا ٹڈی دل تھا مارے گئے۔ کیچڑ میں پھنس کر رہ گئے۔ جو اُن بلاؤں سے بچے وہ آنکھیں بند کر کے پانی میں

کُود پڑے۔ بادشاہ نے بھی دریا میں گھوڑا ڈالا بستارہ ایسا ڈوبا تھا کہ بیچ مانجھ دھار میں جا کر گھوڑا بھی غوطے کھانے لگا۔ بادشاہ نے دیکھا کہ لشکر کا ایک سقہ اپنی مشک پر تیرتا چلا جاتا ہے۔ ہاتھ اٹھا کر آواز دی کہ اے آبِ حیات کے فرشتے لینا کہ وقت لینے کا ہے اور مانگ کیا مانگتا ہے؟ اس نے کہا کہ دو پہر کی بادشاہت۔ غرض پیٹھ پر ڈال ہاتھ پاؤں مار، کنارے پر پہنچا دیا۔ چنانچہ بادشاہ نے آگرے پہنچکر وعدہ وفا کیا۔ اس نے بھی دو پہر کی بادشاہت میں تمام بھائی بندوں کو نہال کر لیا اور اپنا سکہ یہ بٹھایا کہ مشکیں کتروا کر چام کے دام چلا ئے۔ شیر خاں نے یہ بڑی انسانیت کی کہ بادشاہ بیگم اس دارو گیر میں وہیں رہ گئی تھی۔ اسے نہایت ستر پردے سے رکھا اور بڑی عزت و حرمت سے ہمایوں کے پاس بھجوا دیا۔ غرض ہمایوں نے خلوت میں تمام سرداروں کو جمع کیا اور بھائیوں کو بلا کر آپس کے فساد کا انجام اور اس مقدمے کا نشیب و فراز سمجھایا۔ انہیں شیر خاں نے یہ بھلاوا دے رکھا تھا کہ اگر تم اس معاملے میں الگ رہو تو بعد فتح کے پنجاب کا ملک تمہیں دے دوں گا۔ یہ سمجھے کہ ہمایوں کے آگے ہمارا چراغ جلنا محال ہے اور یہ کانٹا نکل جائے تو شیر خاں کچھ مال نہیں۔ خرگوش کی طرح جھاڑیوں میں بھگا بھگا کر مار لیں گے چنانچہ بھائی سے حیلے حوالے کر کے پنجاب کی طرف پہلو بچا آئے۔ شیر نے چھ مہینے کے بعد انگڑائی لی اور پچاس ہزار کی جمعیت سے اُدھر بڑھا۔ بادشاہ بھی ایک لاکھ فوج سے پھر نشان اٹھا کر چلا۔ اُدھر سے شیر خاں کا بیٹا ہراول آتا تھا۔ ان کے ہراول نے جاتے ہی شکار کیا اور سارا لشکر مچھلیوں کی طرح پیر کر گنگا پار اتر گیا۔ مگر جب دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا تو مہینہ بھر تک آمنے سامنے پڑے رہے اور لڑائی کے طول نے بادشاہی لشکر کو ایسا دل تنگ کیا کہ لوگ پھر چپکے چپکے سرکنے لگے۔ اوپر سے برسات آئی اُس نے سب کو اگلا برس یاد دلایا۔

ایک دن سرِ شام آسمان کے میدان پر جنگ کا سامان نظر آیا۔ پنجۂ خورشید کے نیچے پھریرا شفق کا لہرانے لگا۔ پھر بادل رنگا رنگ کی وردیاں پہن کر آنے شروع ہوئے۔ رعد کے کڑکے ابھی کڑکا اپنا نہ کہہ چکے تھے جو رات بھی اپنا اندھیرا لشکر لیکر نمودار ہوئی۔ عالم دھواں دھار ہو گیا۔ برق مہتاب اڑانے لگی اور توپیں گرج گرا اولوں کا گولہ برسنے لگا۔ رات بھر یہی عالم رہا۔ مگر صبح ہوتے مشرق کی طرف سے ایک قدرتی گولہ ایسا چلا کہ جس نے سب کے دھوئیں اُڑا دیئے اور عالم میں پھر امن کی روشنی ہوئی۔ چونکہ جہاں یہ اترے تھے وہ جگہ نشیب میں تھی۔ تمام خیموں میں پانی بھر گیا۔ ناچار جگہ بدلنے کا ارادہ کیا۔ غرض یہ تو اپنے اپنے اسباب کے سنبھالنے میں

لگے ہوئے تھے اور عین صبح کا وقت تھا جو شیر خاں تمام فوج کو لے کر دفعتہً آن پڑا۔ سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور بے تحاشا بھاگے۔ افغان تلواریں کھینچ کھینچ کر دوڑے۔ پل توڑ کشتیوں پر سوار ہو گئے اور جو طوفان زدہ موت کے دریا میں غوطے کھا رہے تھے بلا کی طرح ان کے پیچھے پڑ گئے۔ نیزے، برچھی، تیر، تفنگ سے شکار کرتے تھے اور تلوار کے گھاٹ سے ملکِ عدم میں اتار دیتے تھے۔ جواں مرد بادشاہ نے چاہا کہ آج اسی میدان میں جان دے دے، مگر خدا کو ابھی اس سے اور اس کی اولاد سے بڑے بڑے کام لینے تھے۔ اتفاقاً گھوڑا تیر کھا کر بھاگا، دریا کے کنارے پر ایک خواجہ سرا فیل سوار کھڑا تھا۔ اس نے دیکھتے ہی ہاتھی بٹھا دیا اور سوار کر کے دریا کی طرف لے چلا۔ فیل بان سے کہا کہ ہاتھی دریا میں ڈال۔ اس نمک حرام کی نیت بگڑی ہوئی تھی۔ جیلے حوالوں میں وقت ٹالنے لگا۔ خواجہ سرا خوجہ تھا مگر ہمتِ مردانہ میں کوئی کسر نہ تھی۔ اسی وقت تلوار گھسیٹ فیلبان کو دو ٹکڑے کر کے گرایا اور آپ آگے بیٹھ ہاتھی کو دریا میں ہول دیا۔ گنگا سا دریا، برسات کا موسم اور ہاتھی انجانوں کے نیچے، غرض کہ ڈوبتے اچھلتے کنارے پر پہنچے۔ مگر ایسی جگہ پر جا کر نکلے کہ وہاں سے کڑاڑا بہت اونچا تھا۔ اتفاقاً ایک سردار اور دو سپاہی پہلے پار پہنچے تھے۔ وہ دیکھتے ہی دوڑے۔ سر کی پگڑیاں اور کمر کے پٹکے کھول کھول کر رسا بٹا بادشاہ کو کھینچ کر نکالا اور پھر آگرے میں آئے۔

اس فتح سے شیر خاں شیر شاہ بن گیا اور آگرے کا رخ کیا۔ ہمایوں بہت گھبرایا۔ ناچار پنجاب میں آیا کہ بھائیوں سے کچھ صورت بنے۔ مگر بھائی حضرتِ یوسفؑ کے بھائی نکلے اور جب سنا کہ شیر خاں یہاں بھی آیا تو انہوں نے کہا کہ ہم تو کابل اور قندھار پر قناعت کرتے ہیں، تمہیں اپنا اختیار ہے۔ ہمایوں حیران رہ گیا۔ ناچار سندھ کا رستہ لیا اور وہاں کے سرداروں سے مدد مانگی مگر نہ اس ریگستان کی مٹی میں کچھ سکت تھی نہ اس میں کچھ نظر آتا تھا جس امید پر کوئی رفاقت کرے۔ بعض نے مدد کی، بعضوں سے لڑائی بھڑائی بھی ہوئی۔ آخر اس ویرانے میں جب کھانے پینے کا بھی ٹھکانا نہ دیکھا اور جودھپور والے کی چند تحریریں پہنچیں تو ارادہ کیا کہ ملتان بیکانیر کے ویران رستے سے دفعتہً جودھپور پہنچے اور عین ہندوستان کے بیچوں بیچ سر نکالے چنانچہ اسی ارادے پر روانہ ہوا مگر اس تباہی کی تکلیفیں حدِ بیان سے باہر ہیں۔ ریگستان کی راہ اونٹ

کے سوا گھوڑے کا گذارہ نہیں ۔ رستے گم ، دن کو آگ برسے ، رات کو کوچ کرنا پڑے ، ستاروں کے حساب پر رستہ چلیے ، کوسوں پانی کا پتہ نہیں ۔ غرض جب جیسلمیر پہنچا تو راجہ نے دیکھا کہ ایک ترک بے سروسامان چلا جاتا ہے ، فوج دوڑا دی ۔ یہ بھی جان سے ناامید تھے ، لڑ بھڑ کر ان سے پیچھا چھڑایا ۔ جب جودھپور دس کوس رہا تو آپ ٹھیر گئے اور ایک آدمی خفیہ خبر لینے کو بھیجا ۔ وہاں ایک باوفا کہ پہلے ہمایوں کا کتابدار تھا ، اب راجہ کا نوکر تھا ۔ یہ شخص اس سے جا کر ملا تو معلوم ہوا کہ پہلے بیشک راجہ رفاقت پر تھا ، مگر ایک تو شکستوں کے حال مفصل سنے ۔ دوسرے شیر شاہ کے وکیل پہنچے ۔ اب اس کا قطعی ارادہ ہے کہ اگر ہمایوں ہاتھ آئے تو شیر شاہ کے حوالے کر کے سرخرو ہوجیے ۔

یہاں بے سروسامان خدا کی آس پر جنگل میں پڑے تھے جو رات کے وقت یہ خبر آئی ۔ سب گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے ۔ اور انہی کٹھن منزلوں کو پھر دہرانا پڑا ۔ بلا کے جنگل میں قدم قدم پر نئی منزل اور ایک ایک بات نئی مہم تھی ۔ حاملہ بی بی ساتھ تھی ، جس کی سواری میں ایک نوکر کا گھوڑا تھا وہ بھی اُس نمک حرام نے مانگا ۔ ہرچند بادشاہ نے کہا کہ بھائی وقت کو دیکھ اور بات کو سمجھ ۔ مگر جب اس نے زبردستی اتار دیا تو ناچار اپنے گھوڑے پر بی بی کو سوار کیا اور آپ پیادہ ہو گیا ۔ ایک اور سردار سے گھوڑا مانگا ۔ کیا بُرا موقع تھا کہ اس کور نمک نے بھی آنکھیں پھیر لیں اور اگر گھوڑا ہاتھ آیا تو قسمت سے مر گیا ۔ آخر ایک اونٹ ملا ، اسی کو غنیمت سمجھ کر سوار ہو گیا ۔ اسی عالم میں اپنے کوکہ کو دیکھا کہ مردار سے گھوڑے پر ماں کو سوار کیا ہے اور آپ ہانکتا چلا جاتا ہے ۔ بادشاہ کو ترس آیا ۔ بڑھیا کو اپنے پیچھے بٹھا لیا اور کوکہ کو اس گھوڑے پر سوار کیا ۔ اگرچہ پیچھے راجہ کی دوڑ کا بھی کھٹکا لگا تھا مگر پانی کی نایابی غضب تھی ۔ بہتوں نے تڑپ تڑپ کر جان دی اور جو زندہ تھے وہ مُردوں سے بدتر تھے ۔ جب منزلوں کے بعد گاؤں آتا تو گنواروں کو گوارا نہ ہوتا کہ بوند پانی دیں اگر وہ دیتے تو یہاں آپس میں کٹ کر چند پیاسوں کے خون بہتے ۔ قسمت سے ایک کنواں نظر آیا ۔ سب وہاں اتر پڑے ۔ مگر ادھر کے کنوئیں میں پانی بہت دور ہوتا ہے ۔ چنانچہ آدمی ڈول کھینچکر لے جاتا ہے ایک کنوئیں پر کھڑا ہوتا ہے ۔ جب ڈول نکلتا ہے تو کنوئیں والا ڈھول بجاتا ہے ۔ تب کھینچنے والے کو خبر ہوتی ہے کہ وہ ٹھیر جاتا ہے ۔ لوگ ایسے پیاسے ہو رہے تھے کہ جب کنوئیں میں سے ڈول نکلا تو دس پانچ آدمی ایک ہی دفعہ اوپر جا پڑے ۔ چند مرتبہ پانی ضائع

ہو کر ڈول کنوئیں میں گر پڑا۔ بڑے بڑے جوانمرد مارے پیاس کے تڑپتے تھے اور زار زار روتے تھے۔ کئی آدمی کنوئیں میں گر کر پیاس کے عذاب سے چھوٹے۔ آخر پتوں کے دونے بنا کر اور سر کی پگڑیاں کمر کے پٹکے لگا کر پانی کھینچا اور جن کی زندگی تھی انہیں نصیب ہوا۔ کئی دن کے بعد چلتے چلتے ایک جوہڑ پر پہنچے۔ اونٹ اور گھوڑے مدت سے پیاس بھر پانی کو ترس رہے تھے، اتنا پی گئے کہ اکثر تو جان سے جاتے رہے۔ غرض پچھلی رات باقی تھی غنیمت سمجھ کر دم کے دم آرام لیا۔ مگر صبح ہوتے ہی سب کے منہ فق ہو گئے کیونکہ بستروں پر آنکھ کھول کر پہلے جس کی صورت دیکھی وہ کالا غبار تھا۔ جس میں سے جودھپور والے کا بیٹا نکلا۔ اور آتے ہی للکارا کہ اے ترکو مسلمانو! اے گھر بے خانما نو! تم کون تھے جو بے اجازت ہمارے ملک میں چلے آئے۔ مگر تقدیر کی خبر نہ تھی کہ انہیں آفت زدوں میں ایک بی بی کے پیٹ میں وہ بچہ ہے جسے ہند کا شہنشاہ ہونا ہے اور چار دانگ ہندوستان میں اس کے نام کا ڈنکا بجنا ہے۔ یہ دیکھ کر مصیبت زدوں کی آنکھوں میں موت کی تصویر پھر گئی۔ اور ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگا۔ سنو! راجپوت ان میں سے گھوڑے مار کر آگے ہوئے اور پھیل کر انہیں گھیر لیا۔ جس نے سامنا کیا وہ تو جان سے گیا۔ باقی جنگل میں تتر بتر ہو گئے اور جس جوہڑ پر ان کی زندگی کی آس تھی اُسے انہوں نے قبضہ میں کیا۔ جب بہتوں کو مار کر جی ٹھنڈا کیا تو راجہ کا بیٹا سفید جھنڈا لے کر خود امان دیتا ہوا آیا اور کہا کہ تم لوگ ہمارے علاقے میں بے اجازت کیوں آئے اور دھرم کے راج میں گائے کیوں ذبح کی۔ انہوں نے کہا کہ پیٹ ظالم ہے جب کھانے کو نہ ملے تو کیا کریں۔ بیکسوں کی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ دشمن کو بھی سوائے رحم کے کچھ بن نہ آئی۔ اور جانے کی اجازت دی۔ مگر قدرتی دشمن کو کون ٹال سکے۔ کڑی منزلوں کی بلائیں سامنے تھیں اور قسمت کی گردش پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ آخر مرتے دکھ بھرتے چلے۔ جب قدیمی نمک حلال اور جانی رفیق تڑپ تڑپ کر آنکھوں کے سامنے مر گئے تو شاہ بے سپاہ سات آدمیوں کے ساتھ امرکوٹ میں داخل ہوا۔ راجہ وہاں کا اس عالم میں بھی اسی عالی ہمتی سے پیش آیا کہ جو خاندانی راجاؤں کو بادشاہوں کے ساتھ چاہیے چنانچہ یہاں بیٹھ کر بھی چاروں طرف ہاتھ پاؤں ہلائے۔ مگر قسمت یاور نہ تھی۔ قدم نہ جمے۔ آخر جب کہیں ٹھکانا نہ ملا تو خدا کا گھر یاد آیا۔ حج کا ارادہ کیا اور سب رفیقوں کو لے کر قندھار کے رستے پر چلا۔

ایک دن دامنِ کوہ میں منزل کیے پڑے تھے جو ایک سوار گھوڑا مارے بیرم خاں کو پوچھتا آیا۔ سیدھا اس کے خیمے میں چلا گیا اور کہا کہ قندھار میں عسکری مرزا بادشاہ کے بھائی کو ان کے اس حال سے یہاں آنے کی خبر جا پہنچی۔ چنانچہ انہوں نے تحقیق کے لیے ایک آدمی بھیجنا چاہا۔ چونکہ میرے دل کی عقیدت کی انہیں خبر نہ تھی اس لیے بے تکلف مجھ سے کہا۔ میں نے غنیمت سمجھا اور انہی کے خاصے کا گھوڑا لے کر روانہ ہوا کہ جلد پہنچوں اور حضور کے حقِ نمک سے ادا ہوں۔ بیرم خاں اسی وقت بادشاہ کے پاس دوڑا گیا۔ وہ سن کر بہت گھبرایا اور کچھ سوچ کر تیاری کا حکم دیا۔ جو رفیق ہمراہی میں تجویز ہوئے تھے ان میں گھوڑے بھی پورے نہ تھے۔ غرض رستے کی تکلیف اور گرمی کے سبب سے اکبر کو تو وہیں چھوڑا، آپ بی بی کو ساتھ لے کر ترکستان کا ارادہ کیا۔ بیرم خاں نے آکر پھر عرض کی کہ وطن سے آپ کے والد نے کیا پایا جو آپ پائیں گے۔ خدا پر توکل کیجیے اور ایران کو چلئے کہ وہاں کے لوگ مہمان نواز ہیں۔ دیکھیے شاہ صفی صوفی نے امیر تیمور کے ساتھ کیسا سلوک کیا۔ اس کی اولاد نے حضور کے والد کے ساتھ دو دفعہ رفاقت کی۔ یہ بات ہمایوں کی سمجھ میں آگئی۔ سب کو یہاں چھوڑا اور اس طرف روانہ ہوا۔ ان بائیس آدمیوں میں کوئی ایسا بھی نہ تھا جس نے پہلے وہ رستہ دیکھا ہو اور بدرقہ[1] کا تو کیا ذکر ہے۔ خدا کی قدرت ادھر ان کا یہاں سے نکلنا کہ عسکری مرزا بھی آن پہنچا۔ روانگی کی خبر سن کر دل میں بہت افسوس کیا مگر ظاہر میں کہا کہ میں تو بھائی کے آنے کی خبر سن کر استقبال کو آیا ہوں۔ خزانچی کو بلا کر کہا کہ خزانہ لاؤ مگر اس کا خزانہ حاتم کا خزانہ ہو رہا تھا۔ خیر بھوکوں کے پیٹ کاٹتا تھا اس کا خوب خمیازہ کھینچا۔ اکبر کو لا کر چچا کی گود میں دیا۔ اس نے ظاہر میں بھتیجے کو بہت پیار کیا اور سب کو لے کر قندھار چلا گیا۔

ادھر جب ہمایوں یہاں سے نکلا تو خدا نے ایک بلوچ اپنی قدرت سے بھیج دیا کہ راہ بر ہوا اور بے سامان قافلہ جس کا قافلہ سالار ہمایوں بادشاہ تھا سیستان میں پہنچا۔ وہاں عمل شاہ ایران کا تھا۔ شاہ کی طرف سے پہلے ہی قدم قدم رستے کے لیے مفصل حکم پہنچ گئے تھے۔ حاکم کو مع فوج سرحد پر حاضر پایا۔ چنانچہ جہاں جہاں ہمایوں پہنچتا حاکم شہر پا پیادہ سرحد پر آتا اور نذر دے کر رکاب پکڑ ساتھ ہو لیتا۔ جو کچھ پوچھتا اس کا جواب دیتا۔

---

[1] ان ملکوں کے پہاڑ اور جنگلوں میں بغیر محافظ کے رستہ نہیں چل سکتا۔ ایک شخص اجرت پر ساتھ لے لیتے ہیں کہ جو رستہ بھی جانتا ہے اور ہر طرح کے خطرے کا ذمہ دار ہوتا ہے اسے بدرقہ کہتے ہیں ۱۲

جتنی دور جگہ تھا اتنی دور پیادہ چل کر سوار ہو جاتا اور مع لشکر پیچھے پیچھے روانہ ہوتا۔ جو باغ یا محل اترنے کے لئے ہوتا اس کی آرائش کی کیا تعریف ہو۔ کوسوں مخمل اور زربفت کے فرش پا انداز ہوتے تھے۔ جب وہاں پہنچتے تو جشن شاہانہ سے دربار ہوتا اور سب نذریں دیتے۔ غرض جس حاکم کو دیکھا بندۂ فرمان بردار تھا اور جہاں پہنچا گویا اپنا ہی گھر بار تھا۔ اسی طرح برابر ضیافتیں اور مہمانیاں ہوتی چلی آئیں۔ بیرم خاں کہ رزم میں رستم اور بزم میں ارسطو بن جاتا تھا نامہ لے کر گیا اور جواب نہایت باصواب لایا۔ غرض وہ شہریار بے ملک شہر شہر کی سیر کرتا مشہور مشہور مقاموں کو دیکھتا چلا جاتا تھا۔ جب دار الخلافہ پر پہنچا تو دونوں بادشاہوں میں عجب لطف سے ملاقات ہوئی۔ جہاں خورشید کلاہ ایران میزبان اور امیر تیمور کا پوتا ہندوستان کا بادشاہ مہمان ہو، اُس مہمان داری کی دھوم دھام کا کیا بیان ہو، مگر حق یہ ہے کہ دارائے ایران نے مہمان داری کا حق اس خوبصورتی سے ادا کیا کہ آج تک تاریخوں کے صفحے اس کی خوبیوں سے آراستہ ہیں۔ تمام ملک میں حکم دے دیا کہ شکست کا لفظ زبان پر نہ آئے تاکہ میرے مہمانوں کا دل شکستہ نہ ہو۔ ایک دن شاہِ ایران نے ایوانِ شاہی میں ہمایوں کی ضیافت کی۔ جب دسترخوان اٹھا تو اربابِ نشاط اپنے اپنے کمال دکھلانے کو حاضر ہوئے۔ چنانچہ ایک نے یہ غزل گانی شروع کی۔

ہمایوں منزلے کان خانہ را ماہے چنیں باشد

مبارک کشورے کان عرصہ را شاہے چنیں باشد

شاہ اور تمام اہلِ دربار سن کر اچھل پڑے۔ مگر دوسرا شعر اس نے یہ گایا [۱]

زرنج وراحتِ گیتی مشو خرسنداں مرنجاں دل!

کہ آئینِ جہاں گاہے چناں گاہے چنیں باشد

یہ سن کر ہمایوں کے دل پر ایسی چوٹ لگی کہ آنسو بھر آئے۔ شاہ کو بھی اس بات کا بہت رنج ہوا۔ فوراً اس گویے کو اٹھا دیا اور دوسری چوکی حاضر ہوگئی۔

ایک دن دونوں بادشاہ برابر بیٹھے تھے مگر ہمایوں کا زانو مسند سے ذرا نیچے تھا۔ بیرم خان کو تاب نہ آئی۔ اسی وقت کمر سے چھری نکال اپنا زین پوش کاٹا اور آقا کے زانو کے نیچے بچھا دیا۔ یہ نمک کا جوش شاہ کو بھی بہت بھایا اور ہمایوں سے فرمایا کہ ایسے جان نثار

[۱] ہمایوں کے نام کی رعایت سے اس میں یہ شعر لکھا تھا۔ ہمائے اوجِ سعادت بدام ما افتد اگر ترا گذرے بر مقامِ ما افتد ۱۲

تمہارے ساتھ تھے پھر کیا ہوا کہ یہاں تک نوبت پہنچی۔ اُس نے جواب دیا کہ ان کی رائے پر عمل نہ کیا اور بھائی جو قوتِ بازو ہوتے ہیں وہ درپئے خرابی ہوگئے۔ شاہ نے کہا کہ اس ملک کے لوگوں نے بھی رفاقت نہ کی؟ ہمایوں بولا کہ وہ قوم غیر مذہب غیر جنس ہے۔ ان سے ہم لوگوں کا اتفاق ممکن نہیں۔ شاہ نے کہا کہ جب بادشاہ غیر قوم میں داخل ہو واجب ہے کہ ان سے اتحاد اور یگانگی پیدا کرے۔ اب کی دفعہ تم بھی اس بات کا لحاظ ضرور رکھنا۔ تھوڑی دیر میں دسترخوان بچھا۔ سام مرزا اس کا بھائی کمر بستہ کھڑا تھا۔ اسی وقت سلابچی آفتابہ سامنے لایا اور ہاتھ دھلوائے۔ چنانچہ شاہ نے اشارہ کیا کہ دیکھو بھائیوں کو اس طرح رکھتے ہیں۔ مہمانوں کی تفریح طبع کے لئے کئی دفعہ شکار جرگہ[۱] بھی کیا اور ان میں پہلے اپنے ساتھ ہمایوں کو شکار کھلوایا۔ پھر بیرم خان کو پھر اپنے بھائی سام مرزا کو اجازت دی۔ پھر حکمِ عام ہوگیا۔ غرض کئی برس کے بعد جب مہمان خود مہمانیاں کھاتے کھاتے تھک گئے تو شاہ نے بڑی شان و شوکت سے رخصت کر بارہ ہزار قزلباش کا لشکر ایک جانباز بہادر کی سرداری سے ساتھ کیا اور شگون کے لئے اپنے شیرخوار بیٹے کے نام پر سپہ سالاری کر کے ساتھ کر دیا۔ ہمایوں نے بھی وعدہ کیا کہ بعد فتح کے قندھار شہزادہ کے نام پر کر کے سلطنت ایران سے متعلق کر دیا جائے گا۔ غرض آتے ہی قندھار کا محاصرہ کیا اور کئی مہینے کے بعد فتح کیا۔ عسکری مرزا ننگی تلوار گلے میں ڈال معافی کے لئے سر دربار حاضر ہوا۔ ہمایوں کابل میں آیا وہاں کامران کامرانی کرتا تھا۔ اس نے مقابلہ کیا۔ چند روز تک محاصرہ رہا۔ آخر یہ بھی قلعے کو نہ تھام سکا۔ دیوار توڑ کر رات کو نکل بھاگا۔ فتح یاب لشکر شہر میں داخل ہوا۔ گھر گھر عید ہوگئی۔ شام کو بادشاہ بھی پہنچا۔ شہر کے لوگوں نے چراغاں سے رات کو شب برات کر کے دلوں کی عقیدت کو روشن کیا۔ ہندوستان میں شیر شاہ کا بیٹا بھی کئی برس بادشاہت کر کے مر گیا تھا اور ہندوستان پانچ بادشاہوں میں بٹ گیا تھا۔ ہمایوں کے آنے کو

---

[۱] صورت اس کی یہ ہوتی ہے کہ دامنِ کوہ میں پندرہ[۱۵] بیس[۲۰] کوس کا ایک جنگل جال اور جھاڑیوں سے گھیرتے ہیں۔ پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ کوس کے گرد سے وحشی جانور گھیر کر اس میں ڈالتے ہیں اور گزرگاہوں کو شکاری خود روک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ بیچ میں بلند بلند مقام شاہ اور خاص خاص شہزادوں کے لئے بناتے ہیں۔ بعد اس کے بادشاہ اور شاہزادے اور امیرانِ دربار اسلحۂ شکار اور بہت سے شکاری گتّنے لے کر وہاں پہنچتے ہیں۔ پہلا شکار بادشاہ مارتا ہے۔ پھر درجہ بدرجہ شاہزادے اور امرا کھیلتے ہیں۔ پھر حکمِ عام ہو جاتا ہے چنانچہ ہمایوں کی خاطر کئی معرکے ایسے ہوئے۔

لوگوں نے غنیمت سمجھ کر طلب کیا۔ چنانچہ دوبارہ میدان مار کر دلی پر قابض ہو گیا۔ چاروں طرف فرمان جاری کئے۔ پرانے قلعہ کی مرمّت اور تعمیر کر کے دین پناہ نام رکھا۔ ہمایوں کو علم ہیئت کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ سات سیاروں کے بموجب سات محل بنوائے تھے۔ ان میں ہر سیارے کے مناسب کاروبار اور دربار ہوتے تھے۔ مثلاً اگر جمعرات کو کہ مشتری سے منسوب ہے، علماء اور مشائخ کی صحبت ہوتی تھی تو پیر کو کہ زہرہ سے منسوب ہے ارباب نشاط سے عشرت ہوتی تھی۔ غرض شیر منڈل جس کی ایک ٹوٹی پھوٹی عمارت اب بھی باقی ہے، وہاں کتب خانہ تھا۔ شام کو زہرہ طلوع ہونے والا تھا، اس کے دیکھنے کے لئے کوٹھے پر چڑھا۔ جب اترنے لگا تو زینے سے پاؤں پھسل گیا اور ایسا بے ڈھب گرا کہ بے ہوش ہو کر پھر ہوش میں نہ آیا۔ اسی وقت اٹھا کر اندر لے گئے۔ سارے طبیب جمع ہوئے مگر کوئی دوا کارگر نہ ہوئی اور چوتھے دن مرگیا۔ تاریخ یہ ہوئی کہ۔

ع ہمایوں بادشاہ از بام اُفتاد

اکبر اس وقت جالندھر کے پہاڑوں میں افغانوں سے لڑ رہا تھا۔ اہل مصلحت نے اُدھر تو اسی وقت عریضہ لکھا، اِدھر بادشاہ کا مرنا مشہور نہ کیا۔ کہتے تھے کہ ضعف بہت ہے اس لئے دربار نہیں کر سکتے۔ شکیبی شاعر بادشاہ سے بہت مشابہ تھا۔ اسے کبھی کبھی دیوانِ عام کے کوٹھے پر لباسِ شاہانہ پہنا کر بٹھا دیتے۔ سب نوکر نیچے میدان میں کھڑے ہو کر مجرا کر لیتے اور یہی جانتے کہ بادشاہ بیٹھے ہیں۔ جب اکبر کلانور میں تخت نشین ہو گیا تب اس رازِ مخفی کو کھولا۔

ضلع گورداسپور ۱۲ ؎۱

جلال الدین اکبر بادشاہ

جب کہ ہمایوں جو دھپور کی مصیبت بھر کر امر کوٹ میں پہنچا تو پل کی پل ستارہ نے آنکھ کھولی یعنی اکبر پیدا ہوا۔ شاہ بے سپاہ کے نمک حلال رفیقوں نے الٰہ مبارک بادیں دیں۔ اس کے پاس کوئی رسم ادا کرنے کا سامان نہ تھا چپ ہو گیا۔ لیکن کمر میں ایک مشک نافہ یاد آ گیا۔ وہی نکالا اور شگون کے لئے ذرا ذرا سا مشک سب کو بانٹ دیا[1]۔ خدا کی قدرت اس نحوست کے وقت میں کسے خیال ہو گا کہ اس بچے کی شمیم اقبال بوئے مشک کی طرح تمام عالم میں پھیلے گی۔ چند ہی روز کے بعد قندھار کا سفر پیش آیا۔ اس منزل دنیا کے تازہ وارد کو باپ کا ساتھ دینا پڑا۔ مگر راہ میں ہمایوں تو مرزا عسکری یعنی بھائی کے ڈر سے ایران کو بھاگا۔ بیٹے کو گرمی کے سبب سے جان نثاروں کے حوالے کیا اور ماں کلیجہ پکڑ کر روتی دھوتی خاوند کے ساتھ چلی گئی۔ پیچھے مرزا عسکری یعنی چچا آیا رہا سہا اسباب بھائی کا سمیٹ قندھار کو چلا گیا اور بھتیجے کو کابل میں دوسرے چچا کامران کے پاس بھیجدیا۔ یہ نونہال اقبال کا وہاں پرورش پاتا اور ایسی باتیں کرتا کہ دیکھنے والوں کو تعجب آتا۔ کامران کا بیٹا اس سے کئی برس بڑا تھا اور یہ دودھ پیتا تھا۔ ایک دن چچا نے دونوں کو کشتی لڑوایا۔ اس کی انا۔ ہمایوں اور بیگم کی یاد میں اور اپنی قید میں آٹھ پہر روتی رہتی تھی۔ اس نے شگون لیا اور دل میں کہا کہ اگر اس وقت اکبر نے اس لڑکے کو پچھاڑ دیا تو جانوں گی کہ اس کے باپ کا اقبال بھی ضرور پلٹا کھائے گا۔ خدا کی شان اس نے حریف کو اس طرح اٹھا کر پٹخا کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ کہتے ہیں کہ جب ہمایوں ایران سے پھرا اور کابل کا محاصرہ کیا تو باہر سے قلعہ پر توپیں مار رہے تھے کہ فصیل پر کوئی بیٹھا ہوا معلوم ہوا۔ جب اس پر مارنے لگے تو کبھی توپ رنجک چاٹ گئی۔ کبھی گولا اگل دیا۔ سب حیران ہوئے۔ آخر معلوم ہوا کہ اس طرف سے گولوں کی بہت بوچھاڑ دیکھ کر بے رحم چچا نے بھتیجے کو بٹھلا دیا ہے۔

[1] ترکوں میں دستور ہے کہ ایسے موقع پر ضیافت عام کرتے ہیں اور دولتمند لوگ اپنے نوکروں کو جوڑے دیتے ہیں بلکہ جو پہلے آ کر خوشخبری دے تو جو کپڑے پہنے بیٹھے ہوتے ہیں وہ اسے اتار کر دے دیتے ہیں۔ ۱۲

جب فتحیاب شہر میں داخل ہوئے تو بیگماتیں محلسرا میں جا اُتریں اس وقت عجب لطف ہوا یعنی بادشاہ بیگم بھی انہی میں مل کر بیٹھ گئیں۔ اب اکبر سوا چار برس کا تھا۔ انّا انگلی پکڑے لائی اور کہا کہ لو اماں جان کو پہچانو اور ان کی گود میں جا بیٹھو۔ اکبر نے بیچ میں کھڑے ہو کر سب کو بغور دیکھا اور دوڑ کر سیدھا ماں کی گود میں جا بیٹھا۔ غرض ہونہار بیٹا باپ کے ساتھ کئی برس تک فتوحات میں اپنے اقبال سے مدد دیتا پھرا۔ جب دلّی میں آئے تو باپ دارالخلافہ میں حکمرانی کرتا تھا اور افغان جو پنجاب کے دامنِ کوہ میں چھپے تھے یہ ان پر دشمن شکاری کی مشق کرتا پھرتا تھا کہ دفعتہً باپ کے مرنے کی خبر پہنچی۔ بیرم خاں اتالیق تھا۔ چنانچہ اکبر اسے خان بابا کہتا تھا اور وہی کاروبار کا منتظم تھا۔ اس نے فوراً سرداروں کو جمع کر کے شہزادے کے سر پر تاجِ شاہی رکھدیا اور دلّی کی طرف تختِ رواں کا رُخ کیا۔ رستے میں خبر لگی کہ ہیمو بقال نے آگرہ سے کر دلّی کی طرف باگیں اٹھائیں۔ جالندھر کے مقام پر عرضیاں پہنچیں کہ دلّی کے حاکم نے آگے بڑھ کر میدان کیا تھا۔ مگر خود شکست کھا کر پنجاب کو بھاگا اور ہیمو دلّی میں آگیا۔ اکبر تو لڑکا تھا سنتے ہی چپ ہو گیا مگر تمام سرداروں کی آنکھوں میں شیر شاہی معرکے پھر گئے اور کہا کہ دشمن ایک لاکھ سوار اور ہزار ہاتھی کی فوج رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ اس حال سے مقابلہ کرنا اپنے خون سے ہاتھ دھونا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ یہیں سے کابل کو پھرو۔ سالِ آئندہ میں آکر خبر لیں گے۔ اکبر نے بیرم خاں سے علیحدہ کہا کہ دادا کا نام اور والد کا کام تمہارے دم سے بنا۔ اب تم کہو کہ صلاح کیا ہے؟ اس نے کہا کہ تمام دربار میرے حاسدوں سے بھرا ہوا ہے۔ آپ کے والد کی قدردانی سے میرا گذارہ تھا۔ اس معرکے کا سنبھال لینا بھی کچھ بڑی بات نہیں۔ مگر یہ لوگ میری بات پیش نہ جانے دیں گے۔ اکبر نے ہمایوں کی روح کی قسم دے کر کہا کہ تم کسی کی پروا نہ کرو اور بے تامل جو مناسب دیکھو وہ کرو۔ خان خاناں نے پھر جلسے میں آکر تقریر کا سلسلہ ہلایا۔ سب نے کہا کہ بیگانے ملک میں مر کر لاشے چیل کوؤں کو کھلانے سے کیا حاصل۔ بہتر یہ ہے کہ کابل میں چل کر بیٹھو اور اُدھر سے لشکر لے کر سالِ آئندہ میں مہم کرو۔ بیرم خاں نے کہا کہ جس ملک کو دو دفعہ لاکھوں جانیں دے کر لیا اسے بے مرے مارے دشمن کے حوالے کرنا مردانگی کا منہ کالا کرنا ہے۔ بادشاہ تو آج بچہ ہے مگر ہم تم بوڑھے سردار ہیں۔ آقا نے ستر تیں بڑھا کر

ایران توران تک ہمارا نام روشن کیا لوگ کیا کہیں گے؟ سفید داڑھیوں پر یہ رُوسیاہی اٹھانی بڑے حیف کی بات ہے۔ اکبر اسی چھوٹی سی عمر میں سنبھل کر ہو بیٹھا اور کہا کہ خان بابا میری رائے تمہارے ساتھ ہے۔ اب کہاں جانا اور کہاں آنا بغیر مرے مارے ہندوستان نہ چھوڑیں گے۔ یا تخت یا تختہ۔ بچے کے اس کلام سے بڈھوں کی خشک رگوں میں خونِ مردانگی دوڑ گیا۔ بیرم خاں خان خاناں اسی وقت تلوار ٹیک کر اٹھ کھڑا ہوا اور کوچ کا حکم ہوگیا۔ رستے میں ادھر کے بھاگے ہوئے سردار آکر ملنے شروع ہوئے۔ خانِ خاناں نے بہت شرمندہ کیا اور کہا کہ سبحان اللہ آقا کے بعد اس کے بیٹے کے ساتھ جواں مرد اسی طرح حق نمک ادا کرتے ہیں۔ غرض کسی کو سزا کسی کو دلاسا دیتے چلے۔

ہیمو ڈھوسر بھی نام کو بقال تھا مگر ہمت کا پورا اور عقل کا ٹکڑا ہی تھا۔ دلی لے کر دل اور بھی قوی ہوگیا تھا۔ بڑے بڑے افغانوں کو توپ خانہ دے کر آگے بڑھایا مگر انہوں نے ہراول سے ہاتھی چھٹوا دیئے۔ پانی پت کے ڈیروں دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا۔ ہیمو نے پہلے توپوں کا زنجیر باندھا۔ پھر ہاتھی جن کا اسے بڑا گھمنڈ تھا اور کئی بادشاہوں کے گھر لگا لگا کر جمع کئے تھے، انہیں دیوار فولاد کی طرح قائم کیا۔ ایک ہاتھی پر کہ ڈیل ڈول میں ابرِ سیاہ اور رفتار میں بجلی تھا اور اس کا نام ہوائی رکھا تھا خود صندوقی ہودج میں بیٹھ کر قائم ہوا۔ طرفین کے بہادر داد مردانگی کی دینے لگے۔ اسی حالت میں ایک قضا کا تیر ہودج کو توڑ کر ہیمو کی بھینگی آنکھ میں لگا۔ خون جاری ہوتے ہی تمام فوج میں ہل چل پڑ گئی۔ ہیمو نے آپ تیر کھینچ رومال سے آنکھ باندھ لی اور ہودج میں کھڑا ہوگیا۔ اِدھر اُدھر پھرتا تھا اور سرداروں کو پکارتا تھا، مگر ہاتھی تیروں کی بوچھاڑ سے بھاگا۔ ایک ترک بے خبر تھا کتا ہاتھی دیکھ کر دوڑا اور فیل بان پر تیر جوڑا۔ وہ چلایا کہ نہ مارنا۔ مطلب میرے ہی پاس ہے۔ یہ سن کر خوش ہوگیا۔ تین کوس پیچھے بادشاہ تھے۔ ہاتھی کو گھیر کر وہاں پہنچایا اور باندھ کر سامنے حاضر کیا۔ خانِ خاناں نے اکبر سے کہا کہ پہلی مہم ہے۔ حضور خود شگون فرمائیں کہ جہادِ اکبر ہو۔ وہ ہنس کر بولا کہ بندھے ہوئے دشمن پر؟ غرض بادشاہ نے تلوار چھوا دی۔ خانخاناں نے بیٹھے بیٹھے ایک ہاتھ ایسا مارا کہ اس کا سر پاؤں میں گر کر کابل پہنچا اور بالا حصار کے دروازے پر لٹکا۔ بدن دلی میں بھیجدیا کہ اس فتح عظیم کی خبر خاص و عام کو ہوجائے۔ خود دارالخلافہ میں آیا اور دوبارہ تخت نشینی کا جشن کر کے اہلِ مراد کی مرادیں پوری کیں۔ بعد اس کے صوبوں کے

بندوبست شروع ہو گئے۔ بڑے بڑے راجہ مہاراجہ، ٹھاکر، سردار حاضر دربار ہوئے۔ ہر علم اور فن کے صاحبِ کمال خدمت میں رہنے لگے۔ اکبر اگرچہ خالص تُرک بچہ تھا اور علم سے بے بہرہ، مگر اسی وقت سے سب کے ساتھ محبت اور ملنساری کے ڈھنگ ڈالتا تھا۔ بیٹھتا تو تاریخی داستانیں اور علمی باتیں سنتا۔ اٹھتا تو ہاتھی لڑاتا، شیر مارتا۔ باز اڑاتا، ملک گیریاں کرتا اور ملک بخشتا۔ دکن کی طرف اکثر علاقے فتح کر کے ابراہیم مرزا اور حسین مرزا وغیرہ تیموری شاہزادوں کو دے رکھے تھے اور احمد آباد گجرات میں اپنے کوکہ مرزا عزیز کو صوبہ کیا تھا۔

اکبر کی یلغار احمد آباد گجرات پر

اکبر ایک دن دربار کر رہا تھا اور اکبری نورتن[1] سے سلطنت کا بازار آراستہ تھا جو دفعتہً گرچہ لگا کہ دکن کے حشری باغیوں نے بہت سی جمعیت پیدا کی ہے۔ چنانچہ حسین مرزا اختیار الملک دکنی کو شریک کر کے ان کا سردار ہوا ہے اور ملک مار کر مرزا عزیز کو اس طرح قلعہ بند کیا ہے کہ نہ وہ اندر سے نکل سکے نہ باہر سے مدد جا سکے۔ مرزا عزیز نے گھبرا کر ادھر اکبر کو عرضیاں اُدھر ماں کو خط لکھنے شروع کئے۔ اکبر اسی فکر میں تھا جو محل میں جی جی[2] نے رونا شروع کر دیا کہ جس طرح ہو میرے بچے کو بلا دو۔ بادشاہ نے دیکھا کہ سارا لشکر بھیر و بنگاہ سمیت اس قدر جلد نہیں جا سکتا۔ اس لئے دو ہزار کار آزمودہ اور من چلے بہادر تو اسی وقت روانہ کر دیئے۔ ساتھ ہی رستے کے حاکموں کو لکھا کہ جتنی کوتل سواریاں ہوں تیار کر کے اپنی اپنی انتخابی فوج سے سرِ راہ حاضر ہوں۔ خود تین سو جاں نثاروں سے کہ تمام نامی سردار اور منصب دار تھے، سانڈنیوں پر بیٹھ کوتل گھوڑے لگا، نہ دن دیکھا نہ رات، جنگل اور پہاڑ کاٹ، ستائیس منزلوں کو لپیٹ نویں دن گجرات کے کنارے پہ جا کھڑا ہوا۔ شمار کیا تو تین ہزار جوان علمِ شاہی کے نیچے

---

[1] ابوالفضل - فیضی - خان خاناں - کوکلتاش - حکیم ہمام - حکیم ابوالفتح - بیربل - راجہ ٹوڈرمل وغیرہ امیر رکنِ دربار تھے۔ یہی اکبری نورتن کہلاتا تھا۔

[2] اکبر نے بچپن میں اس کا دودھ پیا تھا۔ اس لئے پیار سے جی جی کہا کرتا تھا۔

مرنے مارنے کو کمر بستہ پائے۔ اس وقت کسی نے کہا کہ کچھ جاں نثار آیا چاہتے ہیں ان کا انتظار کرنا چاہیئے۔ کسی نے کہا کہ شبخون مارنا چاہیئے۔ بادشاہ نے کہا کہ انتظار بزدلی ہے اور شبخون چوری ہے۔ اسی وقت ہتھیار سلاح خانے سے بانٹ دیئے۔ مرزا عبدالرحیم[1] یعنی خان خانان کا بیٹا سولہ برس کا نوجوان تھا اُسے ہراول بنایا۔ داہیں بائیں کی تقسیم کر کے خود سو سوار سے الگ ہوا اور نقارہ کا حکم دیا۔ خان اعظم کو آدمی بھیجا کہ ہم آپہنچے تم اندر سے نکلو۔ اس پر ایسا ڈر چھایا ہوا تھا کہ قاصد بھی پہنچے تھے ہاں سے بھی خط لکھے تھے مگر یقین ہی نہ آتا تھا یہی کہتا تھا کہ دشمن غالب ہے کیونکر نکلوں؟ آخر جب احمد آباد تین کوس رہا تو نقارۂ اکبری پر چوٹ پڑی اور گورکھی[2] کی گرج سے گجرات گونج اٹھا۔ اس وقت بھی غنیم کو اس یلغار کی خبر نہ تھی۔ ڈنکے کی آواز سے اس کے لشکر میں کھلبلی پڑی اور حسین مرزا خود گھوڑا مار کر آیا۔ احمد آباد کے نیچے ایک دریا بہتا تھا۔ اس کے کنارے پر آکر کھڑا ہوا۔ ابھی نور کا تڑکا تھا اور ایک بادشاہی سردار پار اتر کر میدان دیکھتا پھرتا تھا۔ حسین مرزا نے دیکھ کر آواز دی کہ بہادر یہ لشکر کس کا ہے اور سر لشکر کون ہے ؟

اس نے کہا کہ لشکر بادشاہی اور شہنشاہ آپ سر لشکر ہیں۔ مرزا نے کہا کہ چودھواں دن ہے میرے جاسوسوں نے انہیں آگرہ میں چھوڑا ہے۔ سردار مذکور نے ایک قہقہہ مارا۔ مرزا نے کہا کہ اگر بادشاہ ہیں تو ماہی مراتب کہاں؟ اور وہ جنگی ہاتھی کہاں ہیں جو رکاب سے جدا نہیں ہوتے؟

سردار مذکور نے کہا کہ آج نواں دن ہے حضور نے رکاب میں قدم رکھا۔ ہاتھی کیا ہاتھ میں اٹھا لاتے۔ شیر جنگ بہادر بھی ہاتھیوں سے کچھ کم نہیں۔ کس نیند سوتے ہو اٹھو اٹھو آفتاب سر پہ آگیا۔ مرزا الٹا ہی پھرا اور اختیار الملک کو محاصرہ پر چھوڑ کر خود سات ہزار فوج سے سامنے آکر جم گیا۔

بادشاہ کو انتظار تھا کہ خان اعظم ادھر سے زور دے کر نکلے۔ مگر جب وہ دروازے سے سر بھی نہ نکال سکا تو بادشاہ نے کشتی کا انتظار بھی نہ کیا۔ توکل بخدا گھوڑے دریا میں ڈال دیئے۔ ترکوں کا قاعدہ ہے کہ حملے کے وقت دو بلغہ آگے رکھتے ہیں۔ ہراول نے آواز دی کہ دو بلغہ آگے لاؤ۔ معلوم ہوا کہ سلاح خانے کا داروغہ اضطراب میں کہیں بھول آیا۔ اکبر نے کہا کہ آگے بڑھو یہی شگون اچھا ہے کہ سامنے میدان صاف ہے۔ بغرض بادشاہ کی جمعیت قلیل دیکھ کر مرزا خود پندرہ سو فدائی مغلوں کو لے کر سامنے آیا اور بھائی اس کا بائیں پر گرا۔ ساتھ ہی حبشی اور گجراتی فوج بازوؤں پر آئی۔

---

[1] چند روز کے بعد یہی خان خاناں ہوگیا۔ چنانچہ ابوالفضل میں جو رقعے ہیں اور اکثر سخاوتیں جو خاص و عام میں مشہور ہیں وہ اسی سے متعلق ہیں۔ ۱۲

[2] ایک قسم کا نقارہ سمجھنا چاہیئے۔ ۱۲

ادھر سے بھی ترکی بترکی تکہ بکلہ جواب دینے لگے۔ اکبر نے دور سے . . . . . دیکھا کہ ہراول پر زور پڑا۔ راجہ بھگوان داس ان سنگھ کے باپ سے کہا کہ اپنی فوج تھوڑی ہے اور غنیم ہزاروں ہیں۔ چلو ہم تم مل کر جا پڑیں کہ پنجے سے مشت کی چوٹ کڑی پڑتی ہے۔ ان دنوں خواجہ معین الدین چشتی سے بہت اعتقاد تھا اور یا معین کا وظیفہ ہر وقت زبان پر تھا۔ آپ اور تنو سوار یا معین یا معین کے نعرے لگاتے جا گرے۔ اکبر کا نام سنتے ہی مرزا کے ہوش اڑ گئے۔ فوج بکھر گئی اور خود بے سرو پا بھاگا۔ رخسارے پر ایک زخم بھی آیا۔ گھوڑا مارے چلا جاتا تھا کہ ایک چھوٹا سا درخت سامنے آیا۔ گھوڑا جھجکا۔ اس نے چاہا کہ اڑ جائے مگر نہ ہو سکا اور خود گر پڑا۔ بادشاہی سپاہی پیچھے مارا مار چلے جاتے تھے۔ اسی وقت پکڑ لیا اور باندھ کر سامنے لا حاضر کیا۔ ہر شخص کہتا تھا کہ میں نے پکڑا ہے۔ اکبر نے ہنس کر کہا کہ مرزا تم آپ بتا دو تمہیں کس نے پکڑا ہے۔ اس نے کہا مجھے تو حضور کے نمک نے پکڑا ہے۔ غرض ایک ایک کی جانبازی اور جانفشانی کے حال عرض ہوتے تھے اور سپاہی جو گرد و پیش حاضر تھے دو سو بھی نہ تھے کہ پھر ایک۔ پہاڑی کے نیچے سے غبار کی آندھی اٹھی۔ کسی نے کہا کہ خان اعظم نکلا ہے۔ کسی نے کہا کہ غنیم آیا۔ ایک سوار حکم شاہی کے ساتھ دوڑا اور آواز کی طرح پہاڑ سے پھرا۔ معلوم ہوا کہ محاصرے کو چھوڑ کر اختیار الملک ادھر پلٹا ہے۔ بادشاہ نے خود کرنا اٹھا کر پھونکی اور للکارا کہ تیروں کی بوچھاڑ بوچھاڑ۔ جانباز کمانیں سنبھال سنبھال کر سمٹے۔ ہندو اور مسلمان یا معین یا معین کہتے دوڑے۔ نقارچی ایسا گھبرایا کہ نقارے پر چوب تک بھی لگانی بھول گیا۔ بادشاہ نے اسے بھی ڈانٹا اور خود بجلی کی طرح کڑک کر پہنچا۔ چند متواتر فتحوں سے ہندوستان میں یہ دھاک بندھ گئی تھی کہ اکبر نے تسخیر آفتاب کا عمل کیا ہے۔ جوں ہی اختیار الملک نے سنا کہ اکبر اس غول میں خود موجود ہے۔ طوفان کی طرح چڑھا آتا تھا یا بخت برگشتہ کی طرح پیچھے ہٹا اور بھاگتا گرفتار ہو کر مارا گیا۔ جب سارے معرکے طے ہو چکے تو خان اعظم نے بھی صحیح سلامت قلعے سے نکل کر سلام کیا۔ اکبر نے گلے لگایا اور ملک اسی کے سپرد کر کے پھر یلغار ہی کرتا ہوا فتحپور[1] کو پھرا۔ پاس پہنچے تو جو لوگ رکاب میں تھے سب کو دکھنی وردی سے سجایا۔ وہی چھوٹی چھوٹی برچھیاں ہاتھوں میں دیں اور خود ان کا افسر ہو کر شہر میں داخل ہوا۔ فیضی نے دربار عام میں یہ قصیدہ کہکر گزرانا۔ ؎

نسیم خوشدلی از فتحپور می آید | کہ بادشاہ من از راہ دور می آید

[1] فتح پور آگرہ سے کئی کوس پر ایک مقام تھا اکبر نے خود عمارات شاہی سے اور امرا کے مکانات عالی سے باغ ارم کی طرح آراستہ کیا تھا عجیب اتفاق یہ ہے کہ اس کے مرتے ہی سب عمارتیں خاک میں مل کر نیست و نابود ہو گئیں ۱۲

غرض اس طرح کی فتوحات سے کہ جن پر ہزار رستم و اسفندیار کی جان قربان ہو، تمام ہندوستان کو تسخیر کیا اور بنیاد سلطنت کی فقط اس بات پر رکھی کہ کسی کی خوشحالی اور فارغ البالی میں فرق نہ آئے۔ اپنے بیگانے سب آسودہ حال رہیں۔ محاصل کے انتظام، اجناس کی پیداواریں، آمدنی کی تدبیریں، زمینوں کی پیمائش، محصولوں کے بندوبست اور حساب کتاب کے آئین ایسے ایسے باندھے کہ اس وقت تک کسی بادشاہ کو نہ سوجھے تھے۔ ہر قسم کے اہلِ کمال کی قدردانی کرتا اور ہر مذہب کی رعایت کرتا۔ چنانچہ جزیہ کل ہندوؤں سے موقوف کر دیا۔ راجہ اپنے اپنے راج پر برقرار تھے اور خلوت و دربار میں دم ساز تھے۔ اپنے علماء کے علاوہ بڑے بڑے گنی پنڈت اور گویے گنوان خدمت میں حاضر رہتے۔ اشرفیوں کا ڈھیر سامنے لگا رہتا۔ ہر شخص قسمت کے دامن بھر کے لے جاتا۔ دو ہرے لنگر خانے جا بجا جاری تھے۔ انواع و اقسام کے کھانے پکتے اور ہندو مسلمانوں کو بٹتے۔ جب ہندوؤں سے صحبتیں زیادہ ہوئیں تو معلوم ہوا کہ اس پرانے ویرانے میں بڑا خزانہ ہے مگر دھرم وان پنڈت پتا نہیں بتاتے۔ اس لئے ایک دفتر ترجمے کا مقرر کیا جس میں چند فاضل عربی فارسی کے زبان دان اور بڑے بڑے گنی بدیا دان پنڈت مترجم مقرر کئے اور مکتب خانہ اس کا نام رکھا۔ چنانچہ سنگھاسن بتیسی کی پتلیوں نے ایرانی کپڑے پہنے اور بہت سی کتابیں سنسکرت، عربی، ترکی سے فارسی میں ترجمہ ہوئیں۔ انجیل و توریت کے ترجموں کے لئے شاہانِ فرہنگ سے خط و کتابت کی۔ ابتدا میں دینداری اور خوش اعتقادی کا دریا جوش میں تھا۔ لاکھوں روپے درگاہوں میں چڑھاتا، فقرا کی بہت خدمت کرتا۔ اجمیر تک کئی مرتبہ منزل بمنزل پیادہ گیا۔ فتحپور سیکری میں ایوانِ شاہی کے پاس سب سے الگ ایک عمارت بنا کر عبادت خانہ نام رکھا۔ وہاں رات کو اکیلا شب بیداری کرتا اور ایک سل باہر پڑی تھی اس پر بیٹھ کر نورِ سحر سے دل روشن کرتا۔ تمام مشائخ اور علماء اور امراء جمعہ کی رات کو جمع ہوتے۔ مکان عطر سے معطر اور پھولوں سے گلزار ہو جاتا۔ عقلی اور نقلی اور تاریخی تذکروں سے دل خوش کرتے۔ لوگ انعام و اکرام سے نہال ہو جاتے اور نفیس نفیس کتابیں اہلِ علم کو تقسیم ہوتیں۔ مگر ان لوگوں نے اپنی نشستوں کے مقام اور عزت و احترام میں جھگڑے نکالے۔ اس لئے حکم دیا کہ امرا آفتاب کے رُخ، سادات قبلہ کے رُخ، علماء جنوب کی جانب، مشائخ شمال میں الگ الگ ایوان میں بیٹھیں۔ آپ نوبت بہ نوبت ہر ایک جلسے میں آتا اور ہر چمن سے پھول چُنتا۔ ہمیشہ جماعت سے نماز پڑھتا۔ سات عالم امام مقرر، ہر شخص ہفتے میں ایک ایک دن نماز پڑھاتا۔ ہر سال حج کو قافلہ جاتا۔ ایک دو امیر اس پر میرِ حاج ہوتے

حاجیوں کو سفر خرچ دیتا اور لاکھوں روپیہ کا نقد و جنس بھیجتا۔ ایک دفعہ چھ لاکھ روپیہ بھیجا کہ وہاں محتاجوں کو تقسیم ہو اور ایک عمارت عالی تعمیر ہو۔ جب قافلے کو رخصت کیا تو آپ عین حالتِ حج کی وضع بنائی۔ وہی دو چادروں کا لباس ننگے سر ننگے پاؤں تھوڑی دور قافلے کا ساتھ دیا اور جب بآوازِ بلند لَبَّیْكَ لَبَّیْكَ لَاشَرِیْكَ لَكَ لَبَّیْكَ کہنا شروع کیا تو دیکھنے والوں پر ایک عالم طاری ہوا اور اس انبوہ سے غل نالہ و زاری کا بلند ہوا۔

لطیفہ۔ عبادت خانے کے جلسے میں مرزا مفلس نام ایک فاضلِ کابل کچھ تقریر کر رہا تھا حاجی ملا ابراہیم کہ کج بحثی میں لاجواب تھا، اس نے سوال کیا کہ موسیٰ کیا صیغہ ہے۔ مرزا مفلس اس وقت جواب میں بھی تہیدست نکلے۔ ناانصافوں میں حاجی صاحب کی فوقیت کا شہرہ ہو گیا۔ دوسرے دن اکبر نے کسی اور عالم سے کہا کہ تم رات کے جلسے میں نہیں آئے۔ اس نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ حضور جب وہاں حاجی ابراہیم مجھ سے پوچھے کہ عیسیٰ کیا صیغہ ہے تو میں کیا جواب دوں؟ بادشاہ اور سب صاحبِ فہم بہت محظوظ ہوئے۔ مگر یہ بہار چند روز سے زیادہ نہ رہی کیونکہ حسد تو معلم الملکوت سے علم کے ساتھ ساتھ چلا آتا ہے۔ ان اہل علم نے مباحثوں کے مجادلے بنا دیئے۔ ایک عالم جس مسئلے کو ثابت کرتا دوسرا اسے اُسی پر تکفیر کرتا اور نامعقول تقریروں سے اتنا غل ہوتا کہ آواز سنائی نہ دیتی۔ بادشاہ نے تنگ ہو کر حکم دیا کہ جو ایسے مباحثے کہے، اُسے اٹھا دو۔ آخر ان لوگوں سے بے اعتقاد ہوتے ہونے مقدمے کی صورت بالکل بدل گئی۔

شیر شاہی عہد سے چند متعصب علماء کا بڑا زور تھا کہ ان کے سبب سے اکثر صاحب جوہر جلا وطن پھرتے تھے۔ اس طالبِ کمال کے پاس ابوالفضل اور فیضی جیسے لوگ پہنچے اور ہر مذہب کے باکمالوں کو دخل ہوا۔ آخر رفتہ رفتہ یہ خیال ہو گیا کہ کوئی مذہب اہلِ کرامت سے خالی نہیں۔ چنانچہ قربت کے سبب سے پہلے ہندوؤں کے اہل علم آگے بڑھے اور گفتگوئیں ہونے لگیں۔ لطیفہ ایک دن گائے کی تعظیم میں پنڈت تقریر کر رہے تھے۔ ایک فاضل طبیب نے عرض کی کہ ہماری کتابوں میں بھی لکھا ہے کہ اس کا دودھ شفا ہے مگر گوشت نرا مرض ہے۔ ایک ہندو ظریف بولا کہ حضور اگر گائے میں کچھ عظمت نہ ہوتی تو قرآن میں سب سے پہلے سورۂ بقر کیوں ہوتی۔ اکثر ہندوؤں نے پرانے پرانے اشلوک نکالے جن میں اکبر کی بادشاہت کی پیشین گوئی تھی چنانچہ چند برہمن الہ آباد سے آئے اور عرض کی کہ مکند برہم چاری جس نے اپنا تمام بدن کاٹ کر ہون کر دیا تھا، اس نے یہ اشلوک بھی لکھ کر دیا تھا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

میں عنقریب ایک بادشاہِ با اقبال ہو کر آؤں گا اُس وقت تم بھی حاضر ہونا۔ چنانچہ اسی گیان پر حضور کا دھیان گئے بیٹھے ہیں۔ حساب کیا تو اس کے مرنے اور اکبر کے پیدا ہونے میں فقط تین چار مہینے کا فرق تھا۔ بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ برہمن کو ملیکش یعنی مسلمانوں کے گھر میں جنم لینا خلافِ قیاس ہے۔ عرض کی کہ اس نے اپنی طرف سے تدبیر کی مگر تقدیر سے ہون کی جگہ کچھ ہڈیاں اور لوہا وغیرہ گڑا تھا یہ اُس کا اثر ہے۔

ایک بالاخانہ خوابگاہ کہلاتا تھا۔ اکبر خود اُس میں بیٹھتا تھا اور ایک برہمن کو چارپائی[1] پر بٹھا کر اس میں رسیاں باندھتے اور کھینچ لیتے تھے۔ وہ معلق رہتا اور آفتاب اور ستاروں اور دیوتاؤں کے منتر سکھایا کرتا۔ چنانچہ تسخیرِ آفتاب کا منتر اور اس کے ایک ہزار ایک نام سیکھ کر پڑھنے شروع کئے۔ اکثر شرق کو منہ کر کے سویا کرتا کہ آفتاب خدا کا مظہر ہے اور زراعت و میوہ بلکہ کُل کاروبارِ عالم کے اس پر منحصر ہیں۔ غرض محلوں میں رانیاں تھیں دربار میں راجہ تھے۔ چند روز کے بعد قبلۂ عالم سے مہابلی بن گئے۔ اسلام کی رسموں کو سلام کر کے ڈاڑھی کے ساتھ رخصت کر دیا۔ عیدوں سے زیادہ جشنِ نوروزی اور ہندی تہواروں کی دھوم دھام ہونے لگی۔ جشن کے دن قبا اور خفتان کے ساتھ عمامہ سر سے بڑھا جامہ پہن کھڑکی دار پگڑی سر سے باندھی۔ مبارک گھڑی شبھ لگن دیکھ کر پوجا کے بعد برہمن نے پیشانی پر ٹیکا لگایا۔ جواہر نگار کنگنا ہاتھ میں باندھا۔ ادھر بادشاہ نے تخت پر قدم رکھا اُدھر کھڑا ہی میں بڑا پڑا[2]۔ اور ہون ہونے لگا۔ تلادان میں منوں سونا اور جواہرات چڑھتا اور دربار میں نچھاور ہوتا۔ دسہرے کو باز ہاتھ پر بیٹھتے۔ قلعہ کے برجوں پر شراب رکھی جاتی۔ بادشاہ کے سبب سے ایرانی و تورانی سب اہل دربار اسی رنگ میں رنگے گئے اور پان کی گلوری اُس کا جز ہو گئی۔ گائے کا گوشت اور لہسن پیاز وغیرہ بہت سی چیزیں حرام اور بہت سی حلال ہو گئیں۔ بلکہ جب والدہ کا انتقال ہُوا تو پندرہ ہزار اہلِ دربار کے ساتھ بھدرا کروایا۔ انہی دنوں میں گجرات کی طرف سے آتش پرست آئے۔ انہوں نے کیانی بادشاہوں کے ساتھ پرانا رشتہ نکال کر اپنے مذہب کی روشنی سے نیا نُور پھیلایا۔ ان کی بہت سی رسمیں تو ہندوؤں کے مطابق ہی تھیں۔ حکم ہو گیا کہ قدیم رسمِ فارس کے بموجب آتشکدہ بنے اور آگ اس کی ہرگز بجھنے نہ پائے۔ چنانچہ ابوالفضل اس کے مہتمم ہوئے

[1] شاستر میں حکم ہے کہ جو شخص شاستر کا فیض ملیکش کو روئے زمین پر پہنچائے وہ بڑا گنہگار رہے۔ چنانچہ اسی واسطے یہ بندوبست کیا تھا۔ ۱۲ [2] یہ ایک رسم جشنِ ہنود کی ہے ۱۲

دفتر سے سنہ ہجری موقوف ہو کر سنہ الٰہی اکبر شاہی قائم ہوا بلکہ کل اکبری آئین کا نام آئینِ الٰہی رکھا۔ ملکِ فرنگ سے پادری اور پاپائے آئے انہوں نے کتبِ آسمانی پیش کر کے ان کے مطالب بیان کئے اور بزرگوں کی تصویریں پیش کیں۔ جس وقت حضرت عیسیٰ اور حضرت مریمؑ کی تصویر نکالی تو تعظیم کے لئے دوزانو اٹھ کھڑا ہوا اور اس قدر شوق ہوا کہ ابوالفضل توریت و انجیل کے ترجمے پر مقرر ہوا۔ چنانچہ اوّل ہی اس نے یہ مصرع کہا۔ ؎ اے نامیٔ تو ژژ و کرستو[1]۔ دوسرا مصرع سوچتا تھا جو فیضی برابر سے بولا سُبْحَانَکَ لَاشَرِیْکَ یَاھُوْ بادشاہ کا دل دنیا کی رنگا رنگی کا ایک عجائب نمونہ تھا۔ چنانچہ ان رنگوں کے بعد یہ نیرنگ چھایا کہ میں خود خلیفۃ اللہ ہوں۔ اقبال کی یاوری سے برابر فتحیں ہوتی گئیں جو بات منہ سے نکلی وہ بن پڑی۔ خوشامدی سب پڑھے ہوئے جن تھے۔ انہوں نے اپنا تاریخی تجربہ ذہن نشین کیا کہ ہزار برس کے بعد دنیا میں ایک اولوالعزم خلیفہ خدا اور صاحبِ مذہب پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ اب آپ خلیفۃ اللہ ہیں۔ شاہ خورشید نگاہ جس نے بہت سے مذہبوں سے نور اٹھایا تھا، اس بات سے نہایت خوش ہوا اور دینِ الٰہی اکبر شاہی کا انتظام شروع کر دیا کہ آفتاب کی تعظیم اس کا جزوِ اعظم تھا۔ کلمہ اس کا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اَکْبَرُ خَلِیْفَۃُ اللّٰہِ سلام علیک ہیں اَللّٰہُ اَکْبَرُ اور جَلَّ جَلَالُہٗ پر کفایت ہوتی[2]۔ حکم تھا کہ شراب اتنی پیو کہ بدمست نہ کر دے۔ شیر اور سوٗر شجاع جانور ہیں اس لئے ان کا گوشت بھی شجاعت بخشتا ہے جو مرید کہ دینِ الٰہی میں آتے وہ چیلے کہلاتے تھے۔

دینِ آئین کے حکم تو ہزاروں تھے مگر خاتمہ اس پر ہے کہ جو شخص مر جائے اس کے گلے میں کچھ اناج اور کچی اینٹیں باندھ کر پانی میں ڈبو دیں۔ پانی نہ ہو تو جلا دیں۔

ایک مریدِ خاص مر گیا تو اس کی قبر میں جالی رکھی گئی کہ آفتاب کی روشنی پہنچتی رہے بلکہ چراغ کی لو بھی منہ کو لگائی کہ روشنی اور آگ پاک کرتی ہیں۔

عالم بھی ایسے ایسے جمع ہو گئے کہ قاضی نظام بدخشی ایک بڑا فاضل صاحبِ تصنیف تھا جس کا خطاب قاضی خاں تھا۔ چنانچہ سجدۂ زمین بوس کا مصنف وہی تھا۔ ملّا عالم کابلی اس پر افسوس کیا کرتا تھا کہ ہائے یہ نکتہ مجھے پہلے نہ سوجھا۔ داڑھی منڈوانے کے لئے بھی چند وجوہات پیدا ہو گئیں۔ نور کے تڑکے بادشاہ کی صورت دیکھنی عبادت تھی اسی واسطے لب دریا

---

[1] یعنی اے خدا کہ تیرا نام جیزس کرائسٹ ہے اور جیزس کرائسٹ سے عیسیٰ مسیح مراد ہے۔ ۱۲

[2] یہ وظیفہ خاص اہلِ خلوص کے لئے تھا ۱۲

شرق رویہ مکان میں بیٹھتے تھے اس کا نام جھروکہ درشن تھا کہ لوگ وہاں سے مہابلی کے درشن کریں اور وہ سورج دیوتا کے درشن کرتے رہیں۔ اگرچہ بیربل بھی دینِ الٰہی کے رکنِ اعظم تھے مگر ابوالفضل خلیفہ تھے کہ انہی کے ذریعہ سے چیلے پیش ہوتے، مریدوں کے لئے چار منزلیں خلوص دل کی تھیں۔ ترکِ مال، ترکِ عیال، ترکِ زن۔ ترکِ ایمان اور اس میں بڑے بڑے امرا اور رکن دربا داخل ہوتے، چنانچہ خلیفہ کی تصدیق سے اقرار نامہ لکھ کر گذرانتے۔ خلاصہ مضمون اُس کا یہ ہوتا کہ میں فلاں ابن فلاں عقیدت دل سے اقرار کرتا ہوں کہ اسلام مجازی اور دینِ تقلیدی کو چھوڑ کر دینِ الٰہی اکبر شاہی میں داخل ہوا اور چاروں خلوصوں کو صدقِ دل سے قبول کیا۔ چیلوں کو بجائے شجرے کے ایک تصویر بادشاہ کی مل جاتی تھی اور اللہ اکبر کا وظیفہ[1] ہوتا۔

لطیفہ۔ خانِ اعظم اکبر کا کوکہ اور سپہ سالار ایک سیدھا سادھا مسلمان تھا کہ داڑھی اس کی بہت لمبی تھی وہ کسی علاقے پر تھا۔ کئی دفعہ بادشاہ نے اسے بلایا وہ کاروبار کے سبب سے نہ آسکا۔ آخر فرمانِ تاکیدی میں یہ بھی لکھا گیا کہ معلوم ہوتا ہے تمہیں ڈاڑھی کا بوجھ ملنے نہیں دیتا جو یہاں تک آؤ۔ ناچار ہو کر بچارا حج کو چلا گیا۔ مگر آکر سجدہ بھی کیا، ڈاڑھی کو بھی صفائی دی اور مریدوں میں بھی داخل ہوا۔

ایک دن تجویز ٹھہری کہ نماز جمعہ کے بعد بجائے خطبہ کے خلیفۃ اللہ کچھ آپ ارشاد کریں۔ چنانچہ تمام امرا جمع ہوئے مگر جب خلیفۃ اللہ منبر پر چلے تو دفعۃً تھرتھرانے لگے اور جو کچھ سوچا تھا ایک حرف زبان سے نہ نکلا۔ آخر فیضی کے چند شعر پڑھ کر اتر آئے کہ وہ بھی اور لوگ بتاتے گئے۔ خود بھی عبادت کرتے تھے مگر ڈھنگ اس کا نرالا رکھا تھا یعنی آفتاب کے سامنے دونو ہاتھ کانوں پر رکھ کر کھڑے ہوتے کچھ اچھلتے کچھ چکر کھا کر کانوں پر ملکے مارتے جاتے تھے۔ اپنا سر بھی تالو پر سے منڈواتے تھے کہ بزرگوں کی روح تالو میں سے نکلا کرتی ہے۔

بدبا وان پنڈتوں نے ایک ہزار ایک نام ان کا بھی تصنیف کیا کہ وہ چیلوں کا وظیفہ تھا۔ جب آپ عبادت کر کے باہر آتے تو چیلے انہیں دیکھتے ہی سجدے میں گر پڑتے۔ عبادت کا وقت صبح اور آدھی رات تھی۔ ان دونوں وقتوں میں اذان کی جگہ نوبت اور باجے بڑے زور شور سے بجتے تھے۔ جانور کا ذبح اتوار کو تمام ملک میں منع تھا کہ خلیفۃ اللہ کا جنم دن ہے۔ جشن ولادت میں مہینہ بھر تک ذبح کی ممانعت رہتی تھی۔ حکم تھا کہ ذبح کرنے والے کا ہاتھ اور جو شریک ہو اس کی انگلی[2] کاٹ لو۔

---

[1] یہ وظیفہ خاص اہل خلوص کے لئے تھا ۱۲ [2] اس حکم کی تعمیل بہت کم ہوتی تھی فقط زبانی دھمکی تھی ۱۲

چونکہ ان باتوں سے نئے کرامات کا لازمہ بھی ضرور ہے اور ان میں سے یہاں کچھ نہ تھا اس لئے صاحبِ کرامت فقیروں اور جوگیوں وغیرہ کی بہت تلاش رہتی تھی لوگوں نے کہا کہ خطا اور تبت میں لامے گرد ترکِ دنیا کر کے پہاڑوں میں دو دو سو برس تک زندگی کرتے ہیں اور بڑی بڑی عمریں پاتے ہیں۔ اس لئے بادشاہ نے بھی محلّوں میں جانا چھوڑ دیا۔

لطیفہ۔ ایک مکار اسی شہرِ لاہور میں مشہور ہوا کہ دریا کے کنارے پر باتیں کہتے کہتے دفعتہً بے پل و بے کشتی پار جا کھڑا ہوتا ہے اور وہیں سے آواز دیتا ہے کہ تم گھر جاؤ اب ہم جاتے ہیں۔ بادشاہ نے اسے بلا کر خلوت میں بہت سے دم دیئے اور اخیر میں دھمکا کر سمجھایا۔ تب اس نے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ سب اس دوزخ کے واسطے ہے اور حقیقتِ حال یہ کھلی کہ آپ تو باتیں کرتے کرتے پانی میں کود کر اِدھر اُدھر چھپ جاتا تھا۔ بیٹا اس کا ہم آواز تھا وہ پار کھڑا رہتا تھا اور وہاں سے آواز دیتا تھا۔ لوگ جانتے تھے کہ شاہ جی نے کرامات دکھائی۔

باوجود ان باتوں کے کمال اور ہنر کا طالب اور شجاعت کا نہایت قدردان تھا جب اس کی قدردانی سے اہلِ فرنگ کی آمد و رفت جاری ہوئی تو ایک باجا آیا اس کا نام ارغنوں تھا۔ لفظ میں تو ارگن کا معرب معلوم ہوتا ہے مگر اس میں بہت کچھ کھڑاگ تھا یعنی ایک بڑا صندوق تھا اور جدھر سے کھول کر بجاتے تھے ادھر مور کی دم یا کسی اور جانور کے پر لگے تھے کہ انہیں انگلیوں سے دباتے تھے۔ اس سے ایسے نغمہائے رنگین نکلتے تھے کہ سننے والے حیران رہ جاتے تھے۔ پھر مشہور ہوا کہ اس کے اندر دو آدمی بھی ہیں ان کا کچھ تصرف ہے۔ ان لوگوں نے بلون اُڑا کر دیکھنے والوں کی عقل اُڑائی۔ شاہزادہ مراد اور چند امیرزادوں کو فرتیون فرنگی کا شاگرد کیا کہ یونانی زبان سیکھیں۔ حکیم علی گیلانی نے ایک حوض ایسا طلسمات کا بنایا کہ پانی سے لبریز تھا اور اندر ایک پہلو میں وسیع حجرہ کھلا تھا مگر پانی اس میں نہ جا سکتا تھا۔ دریائے راوی میں ایک جہاز بنوا کر ڈالا کہ یہاں سے روڑی اور کوٹری بندر کو رستہ جاری ہو جائے مگر پانی کی کمی سے بمشکل پہنچا رستہ چل نہ سکا۔

ایک دن گفتگو آئی کہ ملک ملک کے لوگوں کی زبان جدا جدا ہے اس لئے انسان کی طبعی زبان کو بھی دریافت کرنا چاہیئے۔ چنانچہ شہر کے باہر بہت دور ایک مکان عالیشان کو سب ضروری سامان سے آراستہ کیا۔ بہت سے لڑکے اور لڑکیاں پیدا ہوتے ہی ماں باپ سے لیں اور انہیں بہت احتیاط سے وہاں رکھا۔ بچوں کی دائیاں اور اہل خدمت اور پہرے کے سپاہی بھی گونگے ہی رکھے کہ انسان کی آواز تک کان میں نہ پہنچے اور مکان کا نام گنگ محل رکھا۔ جب وہ بچے پانچ

پانچ سات برس کے ہوئے تو انہیں دربار میں منگوا کر سامنے چھوڑا۔ سب جنگل کے جانوروں کی طرح غائیں بائیں کرتے تھے۔ ایک حرف سمجھ میں نہ آتا تھا۔

جشن کے دنوں میں مینا بازار لگتا تھا۔ چنانچہ تمام امراء دکاندار بنتے۔ جو جو عجائبات بہم پہنچاتے وہ لاکر سجاتے۔ اہلِ صنعت کے جوہر کھلتے۔ جرِ ثقیل اور طبعیات کے عمل ہوتے، علم ہیئت کے آلات رکھے جاتے، علم کیمیا اور نیرنجات کے شعبدے کام میں آتے جب مردانہ بازار ہوچکتا تو محل کی عورتیں آتی تھیں ان کا بازار گرم ہوتا۔

لطیفہ۔ ایک راجپوت لڑائی میں مارا گیا۔ بی بی اس کی حاملہ تھی۔ جب بچہ پیدا ہوا تو دیکھا کہ جہاں جہاں باپ کے زخم لگے تھے، وہیں بیٹے کے نشان موجود ہیں۔ تذکرہ اس کا دربار میں پیش ہوا۔ سُن کر کہا کہ باپ کے جو زخم لگے تھے تو بدن پر لگے تھے نہ کہ روح پر۔ اس بچے میں اگر اس کی روح خیال کریں تو بدن پر زخموں کے نشان ہونے سے کیا علاقہ؟ اس پر اپنی نقل بیان کی کہ جب خود حمل میں تھا تو ایک دن ہمایوں بادشاہ محل میں آئے دیکھا کہ بادشاہ بیگم اپنے پاؤں کا تلوا سوئی سے گود کر سُرمے سے پھول بناتی ہیں۔ سبب پوچھا تو کہا کہ جی چاہتا ہے ایسا ہی پھول میرے بچے کے پاؤں میں بھی ہو۔ خدا کی قدرت کہ جب اکبر پیدا ہوا تو بعینہ وہی نشان تلوے میں موجود تھا۔

اکبر کی شجاعت اور دلاوری کے معرکے بھی ایسے ہیں کہ انہیں فقط زورِ اقبال کہنا چاہیئے۔ چونکہ اس زمانے میں لڑائی کے وقت ہاتھیوں سے بڑا کام نکلتا تھا اس لئے اس کو بھی ہاتھیوں کا کمال شوق تھا۔ خود سوار ہو کر لڑاتا تھا اور مست ہاتھی کہ جن کے پاس فیلبان نہ جاتے تھے، یہ سائے کی طرح برابر جاتا اور دانت پر ہاتھ رکھتے ہی گردن پر بیٹھا نظر آتا۔ مست ہاتھی[1] لڑتے ہوتے تھے اور یہ ایک پر سے اچھل کر دوسرے پر جا بیٹھتا تھا۔ ایک دفعہ مست ہاتھی چھُٹ کر شہر میں آیا اور لوگوں کے جان و مال ضائع کرنے لگا۔ فیل بان جان کے ڈر سے جرأت نہ کر سکتے تھے۔ اکبر سنتے ہی محل سے نکلا اور جس طرف اس کی آمد تھی اُس طرف بازار میں آکر ایک کوٹھے پر کھڑا ہو گیا۔ جوں ہی ہاتھی برابر آیا جھٹ جست کر کے پیٹھ پر جا بیٹھا اور اس دیو کو زیر کیا۔

لطیفہ۔ ایک دن دو راجپوت نوکری کے طالب آئے۔ اکبر نے پوچھا کہ کیا جوہر دکھا سکتے ہو۔ راجپوت جان ہارنے نیزے لے کر ایک اَنی اپنے سینہ پر رکھی اور دوسری دوسرے

[1] اس کے بعد بھی شاہانِ دہلی نے یہ بات رسوم سلطنت میں داخل رکھی تھی کہ ہفتے میں دو دفعہ ہاتھیوں کی لڑائی دیکھا کرتے تھے ۱۲

رفیق کے سینے پر ساتھ ہی تلواریں کھینچ گھوڑوں کو ڈپٹا۔ دونوں چھد کر بیچ نیزے پر آگئے اور خود ایک ایک تلوار میں ڈھیر ہو کر رہ گئے۔ اس بے جگری پر بادشاہ کو بھی جوش آگیا۔ جانتا تھا کہ کوئی نمک خوار اس طرح میرے سامنے نہ کھڑا ہوگا۔ اس لئے دیوار میں تلوار کا قبضہ گڑوا کر پھل اس کا باہر رکھا اور پیچھے پر سینہ رکھ کر چاہتا تھا کہ آگے حملہ کرے جو راجہ مان سنگھ دوڑ کر لپٹ گیا۔ اکبر نے اسے اٹھا کر دے مارا اور نہایت خفا ہوا کہ تو نے میری دلاوری کا جوہر کیوں نہ کھلنے دیا۔

شیر کے شکار کا عاشق تھا۔ اکثر چیتے اور شیر شمشیر سے شکار کئے۔ چنانچہ اگر اس کی بہادری کے کارناموں کو کوئی پھیلائے تو ایک شاہنامہ تیار ہو جائے۔ آخر پچاس برس کی سلطنت کے بعد ۱۶۰۵ء ۱۰۱۵ھ میں خود شیرِ اجل کا شکار ہو گیا۔ تاریخ ہوئی کہ۔ ع

الف کشیدہ ملایک زفوت اکبر شاہ

نورجہاں بیگم

ملکِ ایران میں خواجہ محمد شریف نام ایک عہدہ دار بادشاہی تھا۔ چونکہ آدمی بالیاقت اور صاحب تدبیر تھا، بڑھتے بڑھتے بادشاہ کے دربار میں وزارت کے مرتبے کو پہنچ گیا۔ چند روز کے بعد اس کا انتقال ہوا۔ مگر وارثوں سے فلک نے دغا کی۔ مرزا غیاث اس کا بیٹا ایسا تباہ ہوا کہ معاش کی تلاش میں گھر سے نکلا اور ایک قافلے کے پیچھے پیچھے مع عیال ہندوستان کو روانہ ہوا۔ بی بی حاملہ تھی۔ اسی حالت میں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ بے سامانی کا سفر، جنگل کا مقام، محلوں کے بیٹھنے والے ماں باپ نے ساری رات جنگل میں روتے دھوتے کاٹی۔ صبح ہوتے پھر روانہ ہوئے مگر لڑکی جو ایسی نحوست کے وقت میں پیدا ہوئی تھی اس کا لے چلنا سخت مشکل ہوا۔ آخر باپ نے اپنی حالت اور بیٹی ذات کے انجام کو سوچا، کہا کہ خدا پر توکل کرو، اس کی قسمت کے حوالے کر کے یہیں چھوڑ دو۔ ہر چند آمتا کی آنچ گود سے اتارنے نہ دیتی تھی مگر جب کچھ بن نہ آئی تو ماں نے بھی کلیجے کے ٹکڑے کو زمین پر رکھ دیا اور روتی چلی گئی۔ ایک رات کی جان جنگل میں پڑی روتی تھی، تھک جاتی تو ہاتھ چوسنے لگتی تھی۔ مگر قسمت سرہانے کھڑی ہنستی تھی کہ جلدی نہ کر

جس محل میں تجھے ملکہ بنا کر بٹھانا ہے وہ ابھی تعمیر نہیں ہُوا۔ پیچھے پیچھے قافلہ بھی آتا تھا۔ اس صبح کے ستارے کو زمین پہ پڑا دیکھ کر سب حیران ہو گئے۔ ایک سوداگر کے دل میں خدا نے رحم ڈالا۔ گود میں لئے منزل پر آیا۔ اس جنگل بیابان میں دودھ کہاں' سارے قافلے میں اس بات کا چرچا تھا۔ کسی کو مرزا غیاث کا بھی خیال آیا۔ سوداگر سے کہا کہ وہ فلک زدہ جو قافلے کے ساتھ ہے اس کے عیال بھی ہمراہ ہیں۔ اگر سپرد کرو تو عجب نہیں کہ اس بچی کی جان بچ جائے۔ غرض کچھ اجرت پر لڑکی اس کے حوالہ ہو گئی۔ اتنی برکت تو پیدا ہوتے ہی معلوم ہوئی کہ کچھ کھانا قافلے سے آنے لگا اور ایک سواری بھی مل گئی۔ سوداگر نے جب مرزا غیاث کی لیاقت اور خاندان کا حال معلوم کیا تو بہت افسوس کیا اور ہندوستان میں پہنچ کر اکبر کے دربار میں پہنچایا۔

ہمایوں بادشاہ جب ہرات میں پہنچا تھا تو خواجہ شریف یعنی مرزا غیاث کا باپ، ہرات کا حاکم تھا اور اس وقت میں بادشاہ کی بہت خدمت کی تھی۔ چنانچہ اب مرزا غیاث نے باپ کے حقوق کو سفارش میں پیش کیا اور چونکہ خود بھی محاسب اور خوش نویس اور شاعر خوش تقریر تھا دیوانِ بیوتات[1] ہو گیا۔ جس طرح اور امرا کی بی بیاں محل میں جایا کرتی تھیں' اسی طرح مرزا غیاث کی بی بی بھی جایا کرتی تھی۔ بلکہ اس کا ایک بیگم سے بہنا یا بھی ہو گیا تھا اور چونکہ اس عرصے میں لڑکی بھی بڑی ہو گئی تھی اس کا نام مہرالنساء رکھا تھا۔ چنانچہ ماں کے ساتھ بیٹی بھی جایا کرتی تھی۔ مگر اسی عالم میں حسنِ خداداد کے ساتھ اس کے آن و انداز کو دیکھ کر ساری بی بیاں کہتی تھیں کہ دیکھئے یہ بجلی کدھر گرتی ہے۔ ایک دن مینا بازار میں پھرتی تھی، جہانگیر کہ ان دنوں میں شاہزادہ تھا دو کبوتر ہاتھ میں لئے روش پر جا نکلا۔ اس وقت سرور کے عالم میں تھا۔ مہرالنساء کا البیلے پن سے چمن میں پھرنا بہت بھایا۔ آپ پھول توڑنے لگا اور اُس سے کہا کہ بی لڑکی ذرا ہمارے کبوتر لئے رہو۔ مہرالنساء نے کبوتر اُس کے ہاتھ سے لے لئے۔ اتفاقاً ایک کبوتر پھڑک کر ہاتھ سے چھُوٹ گیا۔ جب شاہزادہ ادھر متوجہ ہُوا تو پوچھا کہ ہیں میرا کبوتر کیا ہُوا۔ اس نے کہا کہ صاحب عالم وہ تو اُڑ گیا۔ شاہزادے نے کہا کیونکر؟ اس نے دوسرا بھی اڑا دیا کہ حضور اس طرح اڑ گیا۔ یہ بھولے پن کی ادا اس وقت ایسی بھلی معلوم ہوئی کہ شاہزادے کو ایک خیال پیدا ہو گیا۔

---

[1] یہ ایک عہدہ ہے جس سے ۳۶ کارخانے بادشاہی متعلق ہوتے ہیں ۱۲

ماں کو جب یہ حال معلوم ہوا تو بیگم سے شکایت کی اور بیٹی کو محل میں لے جانا چھوڑ دیا بلکہ رفتہ رفتہ یہ شکایت بادشاہ کے کان تک پہنچی۔ اکبر بہت خفا ہوا۔ بیٹے کو خلوت میں بلا کر سمجھایا کہ بیٹا بادشاہوں پر واجب ہے، نوکروں کی بہو بیٹیوں کو اپنی بیٹیاں سمجھیں۔ اگر ہم ایسی باتیں کرنے لگیں تو دنیا میں آج ہی قیامت آجائے۔ تمہیں بھی ایک دن بادشاہ ہونا ہے۔ خبردار پھر ایسا خیال نہ کرنا۔ ساتھ اس کے مرزا غیاث کی بی بی سے بھی کہا کہ تم بیٹی کی کہیں شادی کر دو اور چند روز اسے جہانگیر کی آنکھوں سے الگ رکھو۔

علی قلی خاں ایک شخص شاہِ ایران کے نعمت خانے کا داروغہ تھا وہ بادشاہ کے مرنے کے بعد انقلاب سلطنت سے ملتان میں آنکلا۔ عبدالرحیم خانِ خاناں ان دنوں بھکر پر لڑ رہا تھا۔ اس سے ملاقات ہوئی اور معرکے اس بڑی بڑی جانبازیاں کیں۔ جب خانِ خاناں دربار میں آیا تو اسے بھی حاضر کیا۔ علی قلی خاں جیسا لئیق بہادر تھا۔ ویسا ہی صورت کا وجیہ تھا۔ اکبر نے ایک معزز عہدہ دے کر اس سے مہرالنسا کی شادی کی اور دولھا کے کا صوبہ کر کے بھیجدیا۔ مہرالنساء حسنِ خوبی کے ساتھ عقل کی پُتلی اور لطایف و ظرایف میں بلبل ہزار داستان تھی۔ چند روز میں میاں کو غلام بنا لیا۔ علی قلی خاں کو فنِ رمل میں بھی دخل تھا۔ ایک دن زائچہ دیکھ رہا تھا، بیگم نے کہا ذرا میرا زائچہ بھی تو دیکھو۔ اس نے قرعہ پھینکا اور دیکھ کر کہا کہ بیگم سر پر چترِ شاہی قربان ہوتا نظر آتا ہے۔ بیگم ہنسنے لگی مگر ساتھ ہی جہانگیر کا معاملہ دل میں کھٹک گیا۔ الغرض جب کہ جہانگیر بادشاہ ہوا تو پھر اس کی نیت برگشتہ ہوئی اور عشق کی چنگاری جو کجلا گئی تھی وہ چمک اٹھی۔ علی قلی خاں کو بہانے سے بلا بھیجا اور چاہا کہ کسی ایسے ڈھب سے مروا ڈالے جس کا الزام نہ آئے۔ چنانچہ ایک دن اس کی شجاعت اور بہادری کی بہت سی تعریفیں کر کے مست ہاتھی کے سامنے کر دیا۔ اس شیر جنگ نے اسے مار ہٹایا۔ پھر ایک شیر سے نہتا بھڑا دیا اس نے بے ہتھیار ہی مارا اور شیر افگن خاں کا خطاب لیا۔ جب یہ وار نہ چلے تو ایک رازدار کی زبانی صاف پیغام بھیجا۔ اس غیرت والے کی عزت نے گوارا نہ کیا اور سوچ کر یہی مناسب سمجھا کہ اس نوکری پر لعنت کر کے اپنی جاگیر پر جا بیٹھے۔ بادشاہ نے قطب الدین خاں اپنے کوکہ کو وہاں کا صوبہ کر کے بھیجا اور اشارا کر دیا کہ جس طرح ہو اس کا کام تمام کر دے۔ شیر افگن خاں بے خبر بردوان میں اپنی جاگیر پر بیٹھا تھا، سنتے ہی استقبال کو آیا۔ دو چار جان نثار اس کے ساتھ تھے۔ قطب الدین خاں کے آدمیوں نے فوراً

۱؎ اہل دہلی کے محاورے میں شاہزادوں کو صاحب عالم کہتے ہیں ۱۲

انہیں گرفتار کر لیا۔ شیر افگن خاں دیکھ کر حیران ہو گیا۔ سمجھا کہ معاملہ بگڑ گیا۔ تلوار گھسیٹ کر کوکہ جی کے ایسا ایک ہاتھ مارا کہ دو ٹکڑے ہو کر ہزار سالہ مُردوں میں جا ملے۔ بادشاہی سپاہی دیکھتے ہی ٹوٹ پڑے اور اس تن تنہا کی بوٹی بوٹی بانٹ لی۔ مگر ننگ و نام کے دیوان میں نام اُس کا سر دفتروں میں لکھا گیا۔ اس بے گناہ کے لئے ہزار جرموں کے برابر تو یہی جرم تھا کہ جہانگیر کا رقیب تھا۔ اب تو بادشاہی صوبہ کو مارا، سلطنت کا گنہگار بھی ہو گیا۔ سب گھر بار ضبط ہو کر دربار کو روانہ ہُوا مگر مقصد اسی گوہر شب چراغ سے تھا۔ چنانچہ اب تو پردہ بھی درمیان سے اٹھ گیا۔ ایک بی بی کھلم کھلا پیغام لے کر آئیں۔ مہر النساء سن کر آنکھوں میں آنسو بھر لائی اور بولی کہ شیر افگن جیسے خاوند کو گنوا کر دوسرے کا منہ دیکھنا ننگ و وفا کا منہ کالا کرنا ہے۔ بی بی! تم میری طرف سے حضور میں عرض کرو کہ خیر جہاں پناہ اس بدنصیب پر جو کچھ گزر گئی اس کی تقدیر میں یہی لکھا تھا مگر بیوہ بیکس پر اب رحم فرمایئے اور اُس مرنے والے کی روح کو ایذا نہ دیجئے۔ اس جواب کو جس نے سنا یہی کہا کہ سبحان اللہ لاج والی بی بی جسے اپنے پیارے شوہر کا رقیب سمجھتی ہے اس کی مسندِ شاہی پر اس طرح خاک ڈالتی ہے۔ مگر جہانگیر اس روکھے پن سے بہت اُچاٹ ہُوا تو بھی جو دل کی پھانس تھی وہ لگی رہی۔ چنانچہ کچھ عرصے کے بعد ماں کو اشارہ کیا کہ مہر النساء کو اپنے مصاحبوں میں رکھ لو۔ مدت اس طرح بھی گذری۔ غرض پرچتے پرچاتے آخر کو یہ ہوا کہ مہر النساء سے نور محل اور نور محل سے نور جہاں بادشاہ بیگم بن کر نور الدین جہانگیر کے پہلو میں بیٹھ گئیں۔ نور جہاں حسنِ تدبیر کے ساتھ سلیقے میں بھی بے نظیر تھی۔ بادشاہ تو شراب کا نام رام رنگی رکھ کر اس کی رنگ رلیوں میں لگ گئے۔ اس نے تمام سلطنت سنبھال لی۔ یہاں تک کہ جو حضور میں کچھ عرض کرتا جواب پاتا کہ ہم تو دو پیالے شراب اور ایک سیخ کباب پر سلطنت بیگم کے ہاتھ بیچ چکے۔ جو کہنا ہو ان سے کہو۔ روپیہ اشرفی پر سکہ لگ گیا کہ ؎

بہ حکمِ شاہ جہانگیر یافت صد زیور ۔۔۔ بنامِ نور جہاں بادشاہِ بیگم زر

مُہر کا سجع تھا کہ ؎ نور جہاں گشت بفضل الٰہ ؛ ہمدم و ہمراز جہانگیر شاہ ۔ مرزا غیاث یعنی باپ اعتماد الدولہ ہو کر وزیر سلطنت اور بھائی آصف جاہ ہو کر دربار کے مالک ہوئے۔ خود جھروکے میں بیٹھ کر حکم احکام جاری کرتی تھی اور تمام منصب دار اپنی اپنی عرض و معروض کرتے تھے۔ بادشاہ کا یہ عالم تھا کہ ایک دم بیگم جدا ہوتیں تو بے چین ہو جاتے۔ اگر دم کے دم دربار میں بیٹھتے تو پیچھے پردہ پڑ جاتا۔ بیگم پشت پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہتیں۔ غرض خلوت و جلوت میں اسی کا

جلوہ تھا۔ راجہ مان سنگھ کی بہن۔ مہاراجہ جودھپور کی بیٹی وغیرہ رانیاں اور مہارانیاں تھیں ــ مگر نورجہاں نے سب کے چراغ بے نور کر دیئے تھے۔

بادشاہ کے کئی بیٹے تھے۔ مگر ایک بیٹا دوسرے چھوٹا خرم تھا کہ وہی شاہ جہان ہو کر بادشاہ ہوا۔ چونکہ ابتدا سے یہ شاہزادہ ہونہار نظر آتا تھا، آصف جاہ نے دوراندیشی کی آنکھ سے دیکھ کر اس سے اپنی بیٹی کی شادی کر دی تھی۔

نورجہاں کی ایک بیٹی شیر افگن خاں سے بھی تھی۔ اس کی شادی بادشاہ کے چھوٹے بیٹے شہریار سے ہو گئی۔ اب نورجہاں کو یہ فکر پڑی کہ جہانگیر کے بعد تاجِ شہریاری کسی طرح شہریار کے سر پر رکھا جائے۔ اس لئے بھائی سے بھی کھٹک گئی اور خرم کی طرف سے بادشاہ کے ایسے کان بھرے کہ اس کا ملک شہریار کو مل گیا۔ یہاں تک کہ باپ بیٹے کو لاکھوں کے ساتھ لڑوا دیا۔ ان لڑائیوں میں بادشاہ کی طرف سے مہابت خاں نے بھی خوب خوب جوہر فاداری کے دکھائے تھے چنانچہ اب اس نے ایسا زور پکڑا کہ وہ نورجہاں اور آصف جاہ دونوں کے ہاتھوں سے نکلنے لگا۔ چونکہ دربار نورجہاں کی چٹکی میں تھا، یہاں سے الٹے سیدھے احکام جاری ہونے شروع ہوئے۔ آخر حکم بھیجا کہ اپنے علاقے سے چلے آؤ اور حساب وکتاب سمجھاؤ۔ ناچار مہابت خاں آیا مگر اپنی رفاقت میں پانچ ہزار راجپوت ایسے لایا کہ جو اس کے نام پر سر کٹوانے کو سرخ روئی زندگی کی سمجھتے تھے۔ بادشاہ کابل کو جاتے تھے اور جہلم کے کنارے پڑے تھے جو حاضری کی اطلاع ہوئی۔ حکم ہوا کہ جب تک آصف جاہ کو حساب نہ سمجھا دو، تب تک مجرا موقوف۔ مہابت خاں بہت دق ہوا۔ وہ دن تو ٹالا۔ دوسرے دن علی الصباح دیکھا کہ بادشاہ حرم سرا میں مع چند خواصوں اور خواجہ سراؤں کے رہ گئے ہیں۔ آصف جاہ اور تمام لشکر پار اتر گیا ہے۔ اسی وقت پل اور گھاٹ کو روک خیموں کے گرد راجپوتوں کو پھیلا دیا اور خود گھوڑے پر سوار قناتوں کے اندر بارگاہ کے دروازے پر آن کھڑا ہوا۔ حرم سرا میں غل مچ گیا۔ بادشاہ گھبرا کر باہر نکل آئے اور کہا کہ مہابت خاں کیا کہتا ہے۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی دشمنوں کے ہاتھ سے جان بچا کر حضور کی پناہ میں آیا ہوں۔ بعد اس کے تین دفعہ تصدق ہوا اور اسی وقت پالکی اپنے سپاہیوں سے اٹھوا کر خود کندھا دیتا ہوا اپنے خیمے میں لے گیا۔ نذریں دلوائیں اور بیٹوں کو تصدق کیا۔ ساتھ ہی خیال آتا کہ چال چوک گیا بیگم کو ضرور لینا تھا۔ چنانچہ پھر بادشاہ کو سوار کر کے لایا مگر وہ اتنے عرصے میں پار اتر گئی تھی۔

ناچار شہریار کے پکڑنے کا خیال کر کے اس کے ڈیروں پر آیا اور وہیں بادشاہ کو اتارا۔

ادھر بیگم نے پار جا کر بھائی کے ساتھ تمام سرداروں کو بہت لعنت ملامت کی اور فوج کو تیار کیا۔ یہاں بادشاہ کو بیگم یاد آئیں اور ہر چند حکم پہنچے کہ خبردار لڑائی کا ڈھنگ نہ ڈالنا مگر وہ باز نہ آئی۔ پہلے دن ایک سردار فوج لے کر اترا اور ناکام پھرا۔ دوسرے دن آپ ہودج میں بیٹھی۔ شہریار کی چھوٹی سی بیٹی کو گود میں اور دو خواجہ سراؤں کو آگے پیچھے بٹھا کر سب سے پہلے اپنا ہاتھی دریا میں ڈالا اور فوج کو پایاب اتار کر میدان گرم کیا۔ بہت ترکش تیروں کے آپ خالی کئے۔ آخر ہزاروں آدمی ضائع ہوئے لڑکی گود میں زخمی ہوئی اور بیگم خود اس کا بازو باندھتی ہوئی پار اتر گئی۔

ادھر مہابت خاں سجدے کر کر کے بادشاہ کے تصدق ہوتا تھا مگر قید کر رکھا تھا اور جو چاہتا تھا سو کرتا تھا۔ دو تین دن کے بعد قول و قسم کر کے بیگم کو بلایا لیکن الگ خیمے میں اتار کر قید کر دیا اور جبراً قہراً بادشاہ سے قتل کا حکم لکھوا لیا۔ بعد اس کے خواجہ سرا کو بلایا اور بیگم کو موت کا پیغام سنایا۔ بیگم نے جب حکم سنا تو ہاتھ کے طوطے اڑ گئے۔ مگر تدبیر کے میدان میں ایک قدم نہ چوکی۔ نہایت بے پروائی سے کہا کہ خیر میرے مالک کا یہی حکم ہے تو ایسا مرنا مجھے ہزار جینے سے بہتر ہے۔ ایک دفعہ...... اس کا آخری دیدار دکھا دو۔ مہابت خاں نے بڑی تکرار سے مانا مگر اس شرط پر کہ ملاقات میرے سامنے ہو۔ چنانچہ وہ نورجہاں جس کے پردے کے سامنے سے امرا اور وزرا، پنج ہزاری ہفت ہزاری خلعت پہن کر چلے جاتے تھے۔ نظر بندی کے خیمے سے سکھپال میں بیٹھ کر آئی میلے کچیلے کپڑے پہنے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑتی، ہاتھوں میں سونے کی ہتھکڑیاں، پاؤں میں بیڑیاں پہنے، منہ سے کچھ نہ بولی۔ مگر اس انداز سے آگے کھڑی ہوئی کہ مایوسی اور بے اختیاری کی تصویر سامنے کھینچ دی۔ اس کی صورت دیکھتے ہی بادشاہ کا جگر پانی پانی ہو گیا اور آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ غرض مہابت خاں کی منتیں کر کے جان بخشی کروائی اور تمام لشکر کابل کو روانہ ہوا۔

اب بیگم نے اندر ہی اندر پھر اپنے بندوبست شروع کئے۔ ادھر آصف جاہ جو بھاگے ہوئے تھے وہ بھی صفائی کر کے آ گئے اور مہابت خاں کی مہابت میں فرق آنے لگا۔ مگر راجپوت جنہیں سوا تلوار مارنے کے اور کسی بات کی عقل نہ تھی وہ بدستور زوروں پر چڑھے ہوئے تھے۔ چنانچہ کابل میں...... ایک دن ان سے اور دربار شاہی کے سپاہیوں سے

کسی آپس کی بات پر تلوار چلی۔ کچھ تو ملک غیر تھا کچھ ہوا بدلی ہوئی تھی۔ غرض یہاں راجپوتی کھانڈوں کی کھنڈت ہوئی۔ بہت سے مارے گئے۔ بہت سے بھاگ کر پہاڑوں میں ٹکرائے۔ بہتیرے خراسان و ترکستان میں غلام ہو کر بک گئے۔ مہابت خاں کا زور اور بھی کم ہوا اور نورجہاں پھر اپنی جھپک دمک دکھانے لگی۔ چنانچہ مہابت خاں کو شاہجہان کی مہم کا بہانہ کرکے نکال دیا کہ دشمن کے ہاتھ سے سانپ مرے اور دونوں طرح اپنا مطلب قائم رہے۔ بادشاہ چندروز کے بعد وہاں سے کشمیر پہنچے مگر سردی کے سبب سے دمے کی پرانی بیماری نے زور کیا اور پھر ہندوستان کو پھرے۔ جب ماہ گلے کے مقام پر پہنچے تو شام کے قریب شکار کھیلنے بیٹھے۔ قراول اور وہاں کے پہاڑی زمیندار ہرن وغیرہ شکاروں کو گھیر گھیر لاتے تھے۔ سامنے ایک پہاڑ کی دھار تھی۔ جب ہرن اس کی چوٹی پر آتا تو بادشاہ بندوق مارتے تھے کہ شکار گولی کھا کر قلابازیاں کھاتا نیچے جا پڑتا۔ ایک اجل رسیدہ لڑکا ہرن کو گھیر کر سامنے لایا مگر ہرن ابھی ٹھیک نشانے کے مقام پر نہ آیا تھا۔ یہ بیچارا خدمت کے جوش میں آگے بڑھا کہ اسے روک کر آگے بڑھائے اتفاقاً پاؤں پھسل گیا پاس ایک چھوٹا سا درخت اگا ہوا تھا۔ سہارے کے لئے اس پر ہاتھ مارا مگر وہ بھی ٹوٹ گیا اور یہ اجل کا شکار خود شکار کی طرح ہاتھ پاؤں مارتا قلابازیاں کھاتا پہاڑ کی تہ میں پہنچا کہ ہڈیاں چور چور ہو گئیں۔ بادشاہ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور حرم سرا میں آئے۔ اسی وقت سے طبیعت دم بدم بگڑنی شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ تیسرے دن جہان سے رخصت ہوئے اور تاریخ ہوئی کہ ؎ جہانگیر از جہاں رفت

نورجہاں کی جہانداری کا دن بے نور ہو گیا۔ بہت روئی، بہت پیٹی، منہ نوچا، بال کھسوٹے، اور جس روزِ سیاہ کے اندیشے کا برسوں سے بندوبست کر رہی تھی وہ وقت آگیا۔ آصف جاہ کو بلا بھیجا کہ شہریار کے لئے کچھ تدبیر کرو مگر بھائی کو اپنے گھر میں سلطنت لینی تھی۔ اسی وقت بہن کو نظربند کر لیا اور سب کی آمد و رفت بند کر دی۔ اس نے بھی بہتیرے منصوبے کھیلے۔ مگر عورت تھی، کوئی چال اس کی نہ چل سکی۔ آخر رضا بہ قضا دے کر بیٹھ رہی۔ نورجہاں بڑی سلیقے والی بی بی تھی۔ زیور پوشاک، بناؤ سنگار، گھر کی آرائشوں میں نئے نئے ایجاد کر گئی۔ گلاب کا عطر بھی اسی کی یا اس کی ماں کی گل افشانی ہے۔ گھوڑے پر خوب سوار ہوتی تھی۔ شکار ایسا کھیلتی تھی جس کے نشانے سے ہرن، پاڑھا، چکارا تو کیا ہے۔ شیر و پلنگ کو پناہ نہ تھی۔ چنانچہ ایک دفعہ شیر شکار کیا تو کسی ظریف نے یہ مطلع کہا اور وہ فقرہ عالم میں مشہور ہو گیا

؎ نورجہاں گرچہ بظاہر زن است
درصفِ مرداں زنِ شیرافگن است

حاضرجوابی کا یہ عالم تھا کہ منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ ساتھ اس کے خود بھی شاعر تھیں۔ ایک دفعہ رمضان ختم ہوا۔ بادشاہ نے عید کا چاند دیکھ کر نورجہاں کی طرف دیکھا اور کہا کہ ع ہلالِ عید براوجِ فلک ہویدا شد ٭ اس نے فوراً کہا ع کلیدِ میکدہ گم گشتہ بُود پیدا شد

ایک دفعہ آسمان پر دُمدار تارا نکلا جسے جاہل لوگ بادشاہ یا بادشاہت پر منحوس سمجھتے ہیں۔ بادشاہ محل میں کھڑے دیکھ رہے تھے۔ کسی خواص کے منہ سے نکلا کہ دیکھو تو کیا لمبی شعاعیں ہیں۔ بیگم نے اسی وقت یہ شعر پڑھا۔ ستارہ نیست بدیں طُول سر برآوردہ
فلک بہ شاطریٔ شاہ پر برآوردہ

ایک دن بادشاہ نے جو قبا پہنی تو اس میں لعل کی گھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ نورجہاں نے دیکھ کر یہ شعر پڑھا ؎ ترا نہ تکمۂ لعل ست در لباسِ حریر ٭ شدست قطرۂ خونِ منت گریباں گیر٭

جس طرح خود شاعر تھی اسی طرح شعرا کی قدردانی بھی کرتی تھی۔ چنانچہ ایک دن باغ کی سیر کو گئی۔ تمام باغ میں پردہ ہو گیا۔ منہ پر نقاب ڈالے ہنستی بولتی مصاحبوں کے ساتھ چلی جاتی تھی۔ مرزا صیدی شاعر اسی دن شہر میں پہنچا تھا اور اسی باغ کے کنارے ایک کوٹھے پر اُترا تھا اسے خبر نہ تھی کہ نورجہاں یہی ہے۔ بے تکلف یہ شعر پڑھا ؎ برقع برخ افگندہ برد ناز بباغش ٭ تا نکہتِ گل بیختہ آید بدماغش ٭ نورجہاں نے سن کر حال دریافت کیا۔ پانسو روپیہ تو اسی وقت انعام دیا اور پھر بلا کر شعرائے دربار میں داخل کیا۔ اکثر شعرا سے مباحثے بھی رہتے تھے چنانچہ سلیم شاعر نے ایک دفعہ یہ شعر کہا۔

زشرم آب شدم کاب را شکستی نیست ٭ بحیرتم کہ مرا روزگار چوں بشکست

نورجہاں نے ہنس کر کہا کہ۔ یخ بستہ بشکست۔

ایک دن طالب آملی سے کہا تم حضور کی تعریف میں قصیدے کہتے ہو کچھ ہمارے لئے نہیں کہتے؟ اس حاضرجواب نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ جسے دیکھا نہ ہو اس کی تعریف کیا کروں؟ شاہ جہاں نے بادشاہ ہو کر پچیس لاکھ روپیہ کی جاگیر مقرر کر دی اور بہت عزت و حرمت سے رکھا مگر نورجہاں کی آنکھوں میں جہان سیاہ تھا۔ رنگیلے شوہر کے بعد جب تک زندہ رہی رنگین کپڑے نہ پہنے۔ آخر بارہ برس کے بعد دنیا سے منہ موڑا اور شہر لاہور کے پاس خاوند کے مقبرے[1] کے پہلو میں آرام کیا۔ چنانچہ ٹوٹا پھوٹا گنبد اس کا اب بھی موجود ہے ٭

[1] جہانگیر کا مقبرہ جہاں ہے پہلے یہ مہدی قاسم خاں کا باغ کہلاتا تھا۔ ۱۲

شہابُ الدّین شاہجہان

جب جہانگیر بادشاہ نے جہان کی داروگیر سے مخلصی پائی تو آصف جاہ وزیر نے ہرکارون کے داروغہ کو خلوت میں بلاکر کہا کہ کوئی ایسا تیز رفتار اور بااعتبار ہرکارہ لاؤ کہ اسی وقت ہوا ہوجائے اور یہ ہمارے ہاتھ کی انگوٹھی ہے اسے شاہزادہ خرم تک پہنچادے کہ حیدرآباد دکن میں ہے۔ ایک اشرفی کوس کا تو ابھی حساب سمجھا دو اور انعام پیچھے دیکھا جائے گا۔ چنانچہ منہا بنارسی نام ایک ہرکارہ آیا اور انگوٹھی لے سلام کر روانہ ہوا۔ یہاں مصلحتہً ایک شہزادے کو تخت پر بٹھادیا اور تمام لشکر کو لے کر لاہور میں آیا۔ ادھر ہرکارہ انگوٹھی لے کر اُڑا۔ کوہ و دریا پر سے ہوا کی طرح گزرتا اور ہوا کو گرد کی طرح پیچھے چھوڑتا دو مہینے کی منزلیں بیس دن میں طے کر کے جنیر کے مقام میں شاہزادے کو جا مجرا کیا۔ خسر اور داماد میں پہلے ہی سے اشارے ٹھہرے ہوئے تھے۔ انگوٹھی کو دیکھتے ہی مطلب سمجھ گیا اور فوراً آگرے کی طرف کوچ کیا۔ منزل بمنزل دارالخلافہ میں پہنچا اور جشنِ شاہانہ سے دربار کیا۔ جابجا فرمان جاری ہوئے اور شہاب الدین شاہ جہان کے لقب سے فرمانوں کی پیشانی نے رونق پائی۔

شاہجہانی سلطنت کے لئے اوّل تو کئی پشت سے سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ دوسرے جن ہونہاروں کی طرف سے کھٹکا تھا، تخت پر بیٹھتے ہی ان سے خاندان کو صاف کیا۔ ساتھ اس کے عام رعیت کے لئے بھی اس کی نیت بہت نیک تھی۔ اس لئے کوئی خرخشہ ایسا نہ ہوا جس سے بنیادِ سلطنت میں خلل پڑے۔ خان جہاں لودھی اپنے نمک خوار کی بغاوت کے سبب سے دکن میں فساد ہوا۔ چنانچہ لودھی تو ناکام مارا گیا مگر ملک دکن اسی کی آفت میں گرفتار ہوگیا اور نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ وہاں کے حاکموں سے خاطرخواہ اطاعتیں لینے کے لئے بڑے بڑے معرکے ہوئے اور عہدنامے تازہ ہوکر ان کے زور گھٹائے گئے۔ علی مردان خاں شاہ ایران کے کاردار نے اپنے آقا سے ناراض ہوکر قندھار شاہجہان کو حوالے کردیا مگر شاہ ایران نے پھر چھین لیا۔ ہرچند ایک دفعہ داراشکوہ اور دوسری دفعہ اورنگ زیب بڑے بڑے سامانوں سے گئے مگر دونو ناکام پھر آئے۔ بلخ کو بھی فتح کیا مگر سنبھال نہ سکے۔ اہلِ پرتگال نے چاٹگام میں ایک کوٹھی مستحکم بنائی اور ہگلی

اس کا نام رکھا۔ ڈھاکے کے حاکم کو ان کی طرف سے شبہ پیدا ہوا۔ چنانچہ اس نے دربار کو اُس کی شکایت لکھی اور یہ بھی لکھا کہ یہ لوگ روز بروز گستاخ ہوتے جاتے ہیں بلکہ قلعے پر توپیں بھی چڑھائی ہیں۔ بادشاہ نے حکم بھیجا کہ ان بُت پرستوں کو نکال دو۔ چنانچہ بہت سے آدمی ان کے قتل ہوئے۔ باقی اس طرح نکالے گئے کہ پھر اہلِ پرتگال کو بنگال میں قدم رکھنا نصیب نہ ہوا۔ اس کے علاوہ جاہ وحشم کے آئین نے جشنِ جمشید اور آئینِ سکندر کو گرد کر دیا۔ اکبری عہد کے خلافِ شرع قواعد و آئین جہانگیر کے وقت کے عیشِ رنگین، سب موقوف کئے اور بندوبست کے آئین و قوانین جاری کئے۔

قلعۂ دہلی

جب جاہ وحشم کے ہجوم کے لئے آگرہ اور لاہور کے قلعوں میں گنجائش نہ رہی تو دلّی میں ایک نیا قلعہ[1] بنوانا شروع کیا کہ قلعہ آگرہ سے دوچند اور لاہور سے چند درچند زیادہ ہو۔ چنانچہ کروڑ روپیہ کی لاگت سے دس برس میں بن کر تیار ہوا۔ میرِ عمارت نے عرضی لکھی۔ خود بدولت ہوادارِ آبی پر سوار ہو کر لبِ دریا کے دروازے سے قلعہ میں داخل ہوئے۔ قلعے کو ملاحظہ کیا۔ سر سے پاؤں تک سنگِ سرخ سے گلرنگ۔ اس پر سنگِ مرمر کے حاشیے کا نرالا ڈھنگ، برجیاں، فصیلیں اور مرغولیں خوشنما عمارتیں اور باغ اور باغوں کی نہریں ایسی دلکشا کہ اگر بے مبالغہ بھی ایک ایک کی تفصیل لکھی جائے تو ایک دفتر آراستہ ہو جائے۔ کُل قلعے کا نقشہ دیکھو تو کاغذ پر ایک ہشت پہلو پھول نظر آتا ہے۔

غرض کہ جشن کا سامان شروع ہوا۔ دیوانِ عام کے سامنے وہ شامیانہ کہ جس کا نام دَل بادل تھا اور دیوانِ خاص کے میدان میں سہا منڈل خیمہ استادہ ہوا جس کا کلس خیمۂ فلک کے پار نکلا جاتا تھا۔ یہ بھی سات برس کے عرصے میں تیار ہوئے تھے اور ہزاروں گز پشمینے کشمیر کے اور مخمل زربافت گجرات کے، ان پر خرچ ہوئے تھے دونوں سونے کے ستونوں اور چاندی کے اِستادوں پر کھڑے تھے۔ ان کے آگے خوشنما شامیانے اطلسی و زربافی، سنہری روپہلی چوبوں پر تانے گئے۔ ایوانِ عالی جس طرح طلائی چھت کی میناکاری سے گوناگوں تھا، ویسے ہی ایرانی قالین اور بنارسی کمخوابوں سے بُوقلموں تھا۔

---

[1] سنہ ۱۰۴۸ھ (۱۶۳۸ء) میں بنیاد رکھی گئی سنہ ۱۰۵۸ھ (۱۶۴۸ء) میں تیار ہوا۔ تاریخ ہوئی کہ ~

شد شاہجہاں آباد از شاہجہاں آباد ۞

صدر سے لے کر پائنداز کے ایک ایک مکان تک در و دیوار کو مخمل، زربافت، بادلہ و کمخواب پردہ ہائے فرنگی، دیبائے رومی، اطلسِ چینی سے نگارخانۂ چین کر دیا۔ صدر میں تختِ طاؤس سجایا گیا۔

تختِ طاؤس

نمونۂ عجائباتِ دنیا کا تھا۔ کروڑ روپیہ کہنے کو تو دو لفظ اور ایک بات ہے، مگر خیال کرنا چاہیئے کہ آج اس قدر سونے اور جواہرات کے لئے کس قدر دریا اور پہاڑ الٹنے پڑتے ہیں۔ پُشت کا تختہ جس پر بادشاہ تکیہ لگا کر بیٹھتا تھا دس لاکھ روپیہ کا تھا۔

بارہ مرصع ستونوں پر مغرق محرابیں اور جڑاؤ میناکاری کی چھت دھری تھی۔ چھت سے پایہ تک خالص کندن اور آبدار جواہر سے جگمگ جگمگ کر رہا تھا، اور تین سیڑھی بلند چبوترے پر یہ عالم تھا گویا ایک ستارے کا نگینہ ہے کہ انگوٹھی پر دھرا ہے۔ اس کی روکار کی محراب پر ایک درختِ طلائی بھاری دھرا تھا۔ جسے سبزہ و الماس سے سرسبز اور لعل و یاقوت سے گلرنگ کیا تھا۔ ادھر ادھر اس کے دو مور رنگارنگ کے جواہرات سے مرصع چونچ میں موتیوں کی تسبیحیں لئے اس طرح کھڑے تھے گویا اب ناچنے لگتے ہیں۔ چاروں طرف چار چتر زرنگار۔ جن میں موتیوں کی جھالر جھلملاتی تھی۔ آگے ایک شامیانہ کہ جواہرات اور موتیوں کی آبداری سے دریائے نور کی طرح لہراتا تھا اور ایک لاکھ روپیہ کی لاگت سے تیار ہوا تھا۔ سونے روپے کی چوبوں پر استادہ تھا، گرد اس کے کرسیاں اور چوکیاں اپنے اپنے مرتبے سے سجی ہوئی تھیں۔ تخت کے گرد پاسِ ادب کے لئے کئی کئی گز تک حاشیہ چھوڑ کر چاندی کا کٹہرا ایسا خوشنما لگا تھا کہ جس کی میناکار جالیاں مرغِ نظر کو شکار کرتی تھیں۔ غرض دربار آراستہ ہوا مگر اقبال کا رعب داب دیکھ کر قدرتِ خدا یاد آتی تھی۔ چنانچہ کٹہرے کے باہر اول یمین و یسار شاہزادے والا تبار، بعد ان کے راجہ و مہاراجہ ملک ملک کے حاکم، امیر و وزیر اپنے اپنے عہدے لئے کھڑے مگر تمام فرمان برداروں کی آنکھیں زمین پر اور گوشِ دل اپنے فرماں روا کے حکم پر لگے تھے۔ ہر ایک درے میں دو دو خاص بردار، مخمل کی غلاف دار بندوقیں کندھوں پر، بادلے کی جھنڈیاں ہاتھوں میں لئے بُت بنے ہوئے قائم تھے۔ باہر کے دالان میں اور عہدہ دار منصب دار حکم کے منتظر حاضر تھے۔ اس سے آگے کے دروں میں تین تین حبشی جیسے کالے پہاڑ، آنکھیں لال لال، زربفت کی وردیاں پہنے ہتھیاروں میں اوچی بنے، گرز ہائے فولادی کندھوں پر، بادلے کی

بیرقیں ہاتھوں میں تیسرے درجے میں اہل کار اور ہر کارخانے کے کاروار، منشی، متصدی، قلمدان بغل میں، بستے آگے رکھے موجود تھے اور وروں میں سپاہی ننگی تلواریں علم کئے۔ قدِ آدم، چاندی کے کٹہرے سے لگے خاموش کھڑے تھے۔ باہر تیس تیس گز کا فاصلہ دے کر پھر چاندی کا کٹہرا کھڑا تھا اور اس کے برابر بہادر سپاہی، خاص بادشاہی جن میں دائیں پر ترک، بائیں پر افغان، سامنے راجپوت، اپنی اپنی وردیاں پہنے، سنہری رُوپہلی بیرقیں ہاتھوں میں لئے جمے تھے۔ یہاں سے دروازے تک سواروں کے پرے، دو رستہ پابستہ آراستہ تھے۔ جو درباری لوگ آتے پہرے پہرے پر اپنے اپنے نام نشان بتاتے اور آگے چلے جاتے۔ مگر دبدبہ و دہشت کا یہ عالم تھا کہ ہوش و حواس کے قدم تھرتھراتے تھے۔ دربار میں پہنچکر تین سلام گاہوں پر تسلیم بجالاتے تھے۔ جب نقیب آواز دیتا تھا کہ آداب بجالاؤ، جہاں پناہ بادشاہ سلامت، عالم پناہ بادشاہ سلامت۔ تو دل سینوں میں دہل جاتے تھے۔ کٹہرے کے پاس کورنش کا آداب ادا کرتے تھے۔ غرض اوّل شاہزادوں کی نذریں گزرنی شروع ہوئیں۔ ہر ایک کو خلعت اور ترقی منصب کے احکام سنائے گئے۔ سعد اللّٰہ خاں[1] وزیر اعظم کو ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار کا منصب عنایت ہوا۔

عبرت۔ دربار میں یہ شانِ پروردگار آشکار تھی کہ دفعتہً بادشاہ آبدیدہ ہوئے اور دونوں ہاتھ فاتحہ کو اٹھائے، ساتھ ہی سب اہل دربار نے ہاتھ اٹھائے۔ مگر پاس ادب سے کوئی شخص جرأت سوال کی نہ کر سکا۔ بعد فاتحہ کے خود بادشاہ نے کہا کہ اے بندگان با اخلاص جو خیال اس وقت میرے دل میں گزرا اس کا اظہار تم پر بھی واجب سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ فرعون نے ایک آبنوس اور ہاتھی دانت کے تخت پر بیٹھ کر دعویٰ خدائی کا کیا۔ گواہ اور آگاہ ہو کہ جس نخوت اور تکبر سے اس نے وہ دعویٰ کیا تھا میں اس سے لاکھ مرتبہ عجز و نیاز کے ساتھ عبودیتِ الٰہی کا اقرار کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر اٹھا اور دوگانہ شکرانے کا بجالا کر دیر تک پیشانی کو زمین

---

[1] چنیوٹ علاقہ جھنگ کا رہنے والا تھا اور ایک غریب گمنام کا بیٹا تھا۔ لاہور میں علم حاصل کیا اور فقط علم کی برکت نے اس مرتبے تک پہنچایا کہ شہنشاہ ہند کا وزیر اعظم ہوگیا۔ چنانچہ ۱۰۵۰ھ ہجری میں ملازم ہوا۔ ۱۰۵۵ھ ہجری میں دیوان خالصہ ہوا۔ ۱۰۵۶ھ ہجری میں وزیر اعظم ہوگیا۔ اس کی مسجد مقام چنیوٹ میں اب بھی موجود ہے، جس کے دو مینار سنگ لرزاں کے ہیں، ہلانے سے حرکت کرتے ہیں۔؂

نیاز پڑھتا رہا۔ وقت کی تاثیر سے دربار میں سناٹے کا عالم ہو گیا۔ سب کے دل آب ہو گئے اور سینوں کے ولولوں نے دم گرم سے اس ایوان میں ایک گونج پیدا کی۔ بادشاہ سجدے سے اٹھ کر دوبارہ مسند پر بیٹھا۔ ملک الشعرائنے قصیدہ مبارک باد کا پڑھا۔ کسی باکمال نے گیت سنائے، کوئی اشرفیوں میں تُلا، کسی کا منہ موتیوں سے بھرا گیا۔ اتنے میں غلامانِ خاص جواہر کار خوان ہاتھوں میں لئے آئے۔ - - - - - - - - - - - - - - جن کے جواہر نگار خوان پوشوں میں موتیوں کی جھالر لٹکتی تھی۔ میر دربار نے اشارہ کیا۔ اشارے کے ساتھ ہی سونے رُوپے کے پھول اور جواہرات کا مینہ چھم چھم برسنے لگا۔

رات کو جشن ماہتابی ہوا کہ تمام دیوانِ عام ایک بقعۂ نور نظر آنے لگا۔ فرش میں سفید مخملیں سفید ہی قالین۔ دیواروں پر براق اطلسیں، زربفت و کمخواب کے پردے، مگر وہ بھی رُوپہلی آرائش کے سامان اور روشنی کے سب لوازمات موجود مگر تمام بلور اور شیشے سفید، سامنے چمن اور درختوں کے پھول پتے تمام سفید۔ روشوں پر گھاس سفید، دربار کا لباس سفید یہاں تک کہ انگوٹھی بھی چاندی کی اس پر بھی الماس سفید۔ غرض کہ زمین سے آسمان تک نور کا عالم تھا۔ اور دریائے مہتاب لہراتا نظر آتا تھا۔ چندرما کی تُلا کے جشن میں نو دن باقی تھے۔ اس لئے نو دن تک برابر جشن کے انعام واکرام جاری رہے۔

شاہجہان کی ایک بی بی ممتاز محل آصف جاہ کی بیٹی تھی کہ نہایت نیک نیت و نیک طبیعت تھی۔ چاروں بیٹے بھی اسی کے شکم سے تھے اور جو محبت کہ بادشاہ کو اس سے تھی کسی سے نہ تھی۔ وہ حاملہ ہوئی۔ جب وِلادت کا وقت قریب آیا تو اندر کاروان دائیاں اور باہر حاذق حکیم جمع ہوئے۔ دفعتہً پیٹ میں سے بچے کے رونے کی آواز آئی۔ سب سُن کر حیران بلکہ ہراساں ہوئے۔ بیگم نے خود بادشاہ کو بلایا اور کہا کہ اب وقت قریب آیا ہے دو وصیتیں میری ہیں وہ سُن لو۔ اوّل یہ کہ بعد میرے اور شادی نہ کرنا۔ ایسا نہ ہو سوتیلے بھائیوں میں بگاڑ ہو اور میرے بچوں کی جانیں تلف ہوں۔ دوسرے یہ کہ میری قبر پر ایسی عمارت بنوانا کہ عالم میں یادگار رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد لڑکی پیدا ہوئی اور بیگم کا انتقال ہوا۔ بادشاہ کو بڑا غم ہوا۔ دو برس تک دنیا کی لذتوں کا لطف نہ اٹھایا۔ ناچ رنگ کی صحبتیں بند کر دیں۔ اور دل و دماغ پر ایسا صدمہ ہوا کہ چند روز میں بال سفید ہو گئے۔ عمارت جو بیگم کے مزار پر بنی وہ حقیقت میں ایسی ہی بنی ہے کہ رُوئے زمین پر ثانی نہیں رکھتی۔ چنانچہ

تاج گنج کا روضہ خاص و عام میں مشہور ہے۔ الغرض ۳۱ برس کی سلطنت کے بعد اقبال کا آفتاب ڈھلنا شروع ہوا۔

محی الدین اورنگ زیب کی عالمگیری

اخیر عمر میں بادشاہ خود بادشاہی کرتے تھے اور چاروں بیٹے ملک گیری اور ملک داری کرتے تھے۔ مراد اور شجاع تو نرے شاہزادے ہی تھے۔ دارا شکوہ جو سب میں بڑا تھا شہزادہ پن کے ساتھ فقیری اور تصوف میں بھی ڈوبا ہوا تھا۔ فقرا خواہ صوفی خواہ ویدانتی صحبت میں رہتے، ان کی کتابیں پڑھواتا۔ باتیں سنتا عربی اور فارسی میں تصوف کی کتابیں تصنیف کرواتا بلکہ سنسکرت سے فارسی میں ترجمے کرواتا۔ اورنگ زیب برخلاف ان سب کے ایسا متین شخص تھا کہ پابندیِ شرع کے لحاظ سے ملکی جوڑ توڑوں کے سوا دوسرا خیال نہ رکھتا تھا۔ جابجا پرچہ نویس بٹھائے ہوئے تھے ہر طرف کان لگے رکھتا بلکہ ہر بات کی پیش بندی برسوں پہلے سے کرتا۔ مگر باپ کو چاروں بیٹوں میں دارا ہی پیارا تھا اور اکثر اسی کو پاس رکھتا تھا۔ چنانچہ تیس برس کی سلطنت کے بعد ایک دفعہ ایسا بیمار ہوا کہ کُل کاروبار دارا کے ہاتھ میں آ گئے۔ چونکہ یہ ناز پروردہ اور سلطنت کے کاروبار میں بے تجربہ تھا، باپ کو چراغِ سحر اور تخت کو زیرِ قدم پا کر بھائیوں کے نام ایسے احکام جاری کئے کہ انہیں پڑھ کر اور باپ کو بیمار سُن کر گھبرا اٹھے۔ ساتھ ہی ان کے وکیلوں کو نظر بند کر لیا اور دربار کی خبروں کے بند کرنے کے لئے اُدھر کے سوداگروں اور بنجاروں تک کو بھی روک لیا۔ یہ حال دیکھ کر تینوں بھائی اپنے اپنے علاقوں سے چلے۔ مراد اور شجاع نے تو کھلم کھلا سلطنت کے نشانوں پر پھریرے چڑھا دیئے ۔ ۔ ۔ ۔ مگر اورنگ زیب نے یہاں بھی اپنی متانت خرچ کی یعنی درپردہ پورے سامان کئے مگر ظاہر میں مراد چھوٹا بھائی جو گجرات دکن میں اس کے قریب تھا اُسے نہایت دردمندی کے ساتھ ایک خط لکھا خلاصہ اُس کا یہ ہے کہ مجھے سلطنت کی ہوس نہیں مگر چونکہ دارا شکوہ بدعقیدہ اور بدمذہب ہے اور تم جیسے چھوٹے بھائی پر کہ قابل سلطنت ہو ناحق جبر کرتا ہے

میں برادرِ عزیز کی حق تلفی ناجائز سمجھ کر اعانت فرض سمجھتا ہوں۔ میرا ارادہ یہ ہے کہ اس مہم کے بعد حج کو چلا جاؤں اور وہیں گوشہ عافیت میں بیٹھ کر یادِ الٰہی میں خاتمہ کردوں۔ چھوٹا بھائی نہ سمجھا کہ بڑا بھائی شفقت کے پردے میں دغا کرتا ہے۔ صاف دل سے آیا اور جان و جگر سے رفیق ہو کر آگرے کو روانہ ہوا۔ یہاں بادشاہ کو شفا ہو گئی۔ دیکھا تو عالم تہ و بالا ہے۔ اسی وقت کاروبارِ سلطنت کو سنبھال بیٹوں کے نام فرمان جاری کئے مگر ادھر تو انہیں یقین نہ آیا ادھر دارا شکوہ جو اس عرصے میں ایک دفعہ شجاع کو شکست بھی دے چکا تھا، مقابلے کو تیار ہو گیا۔ باپ بڈھا تجربہ کار تھا وہ اس نازپروردہ کی حقیقت کو بھی جانتا تھا اور اورنگ زیب کو بھی خوب پہچانتا تھا اس لئے مقابلے کو منع کیا اور کہا کہ دونوں تمہارے چھوٹے بھائی ہیں ہم صفائی کرا دیں گے۔ دارا نے نہ مانا اپنی شکوہ میں آکر ان دونوں بھائیوں سے بھی جا لڑا مگر چونکہ میدانِ جنگ کا مشاق نہ تھا اس لئے شکست فاش کھائی اور ہاتھی پر سے ننگے پاؤں کود کر پنجاب اپنے علاقے میں بھاگ آیا کہ یہ ملک وسیع اور باسامان بھی ہے اور ادھر سے ایران کا رستہ بھی کھلا ہے، یہاں بیٹھ کر خاطر خواہ بندوبست ہو جائے گا۔ فتیاب نشان اقبال اڑاتے آگرہ میں داخل ہوئے مگر مراد اس مہم میں ایسی جانبازی سے لڑا کہ شجاعت کا چہرہ زخموں سے گلرنگ ہو گیا۔ ہاتھی کا میکڈمبر مارے تیروں کے سیہہ جانور کا نمونہ بن گیا۔ عالمگیر نے باپ کو عرضی لکھی اور چونکہ آپ نے اب تک سلطنت کا دعویٰ نہیں کیا تھا اس لئے بھائیوں کی بے اعتدالی کا افسوس بھی لکھا۔ باپ نے ایک تلوار بھیجی اور نہایت محبت سے لکھا کہ فتح مبارک ہو مگر مجھے آکر منہ تو دکھاؤ۔ اس نے عذر معذرت کے بہانے کر کے ہمراہ بیٹے کو بھیجا۔ آپ باہر رہا مگر یہیں بیٹھے بیٹھے ایسا پیچ مارا کہ بوڑھا باپ نہ سمجھا۔ سنا تو دفعتہً یہی سنا کہ تمام دروازوں اور چوکی پہروں پر عالمگیری سپاہی بیٹھے ہیں۔ غرض باپ کو قید اور آگرے کا بندوبست کر کے آگے بڑھا۔

مراد کے زخمی ہونے سے اس کی مراد خاطر خواہ برآئی۔ چنانچہ سلطنت کی صورت بنتی دیکھ کر اس کے نامزد کرنے کے بندوبست کرنے لگا۔ روز عیادت کو جاتا اور جو انعام و اکرام فوجوں کو دیتا ان سے کہتا کہ نذریں شکرے بیٹے کی اسی کو جا کر دو۔ چند روز کے بعد ایک دن اپنے خیمے میں اس کی ضیافت کی۔ وہ بے تکلف چلا آیا اور چونکہ اس کا دل صاف تھا اس لئے خاطر جمع سے عیش و عشرت میں مصروف ہوا اور رات کو وہیں رہا۔ اس نے فوراً گرفتار کر کے گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا۔

اب دارا کا حال سنو کہ لاہور میں بیٹھ کر ادھر کے سرداروں کو شامل کیا اور ہندوستان کے راجاؤں کو بغاوت کے لئے خطوط لکھے۔ باپ کو بھی منت و زاری کے ساتھ عرضیاں لکھیں۔ ادھر سے بھی ہر طرف تحریریں جاری ہوئیں۔ چونکہ لاہور کا خزانہ ہاتھ میں تھا لشکر جمع کر کے ستلج اور بیاس کے گھاٹوں کا بندوبست کیا۔ مگر جب ادھر سے سکندری نقارہ بجتا آیا تو دارائی فوجیں بھاگیں اور خود بھی گھبرا کر ملتان پہنچا کہ بھکر سے ہمایوں کے قدموں ایران چلا جائے۔ شاہ ایران کو ایک خط لکھ کر مدد مانگی۔ مگر وہاں سے جواب آیا کہ اس طرح فوج کا مدد کے لئے آنا زیبا نہیں۔ تم خانۂ بے تکلف سمجھ کر یہاں آجاؤ اور چند روز اس ملک کی سیر کرو۔ ہم تمہارے باپ اور بھائیوں سے خط و کتابت کریں گے۔ اگر تحریر سے کام نکلا تو بہتر ہے نہیں تو جس طرح ہوگا تمہارا حق تمہیں دلوا دیں گے۔ اس آوارہ نصیب نے قندھار کا ارادہ کیا مگر ساتھ فقط رفیقوں کی رفاقت اور خدمت گاروں کی جمعیت باقی تھی وہ بھی اکثر ہندوستانی یا وہ ولایتی تھے کہ ہندوستان میں رہ سہہ کر ایسی ایسی محنتوں کے چور ہو گئے تھے۔ رفیقوں نے ساتھ چھوڑنا شروع کیا۔ سب سے زیادہ یہ کہ پیاری بی بی اور کچھ عیال بھی ساتھ کجاووں میں سوار تھے۔ جب کوہستان میں داخل ہوئے اور اونچے اونچے پہاڑ نظر آئے تو بی بی ہندوستان کے محلوں کی پلی رونے لگی اور کسی طرح آگے جانے کو راضی نہ ہوئی۔ دارا کو اس سے نہایت محبت تھی ناچار الٹا پھرا اور ریگستان کے جنگلوں میں گھس گیا۔ اسی حالت میں جسونت سنگھ جودھپور کا راجہ جو پہلے معرکوں میں اس کے ساتھ حقِ رفاقت ادا کر رہا تھا اسی کی طرف سے جواب آیا اور اس نے وہیں بلایا۔ ایسے ڈوبتے کو اس تنکے کا سہارا غنیمت ہوا اور پھر ادھر کی طرف چلا۔ رستے کی مصیبتوں کا کیا بیان ہو کہ ہمایوں کی مصیبتوں سے ابھی قلم کا دم نہیں ٹھیرا۔ غرض جودھپور کے پاس پہنچ کر خط لکھا اور راجہ کا انتظار شروع کیا۔ عالمگیر نے اسے پہلے ہی توڑ لیا تھا۔ جواب میں ادھر سے غبار بھی نہ اٹھا۔ امیر سردار سب گئے بلکہ ناچار ہو کر بیٹے کو بھیجا اور بہت سی منت و زاری کی مگر وہاں سے جو ہمایوں کو ناکامی نصیب ہوئی تھی وہی میراث اسے ملی۔ وہ یہی کہے گیا کہ تم اجمیر میں چل کر ٹھیرو میں وہیں آتا ہوں۔ ناچار یہاں آیا اور ہر چند کہ پہاڑوں کو مورچوں اور توپوں سے سدِ سکندری بنا لیا، مگر نصیبے میں تو خود دارا تھا یہاں بھی شکست کھائی۔ شام تک ایک پہاڑی پر کھڑا لڑائی کا رنگ دیکھا کیا۔ رہے سہے جاں نثار کٹے جاتے تھے اور مورچہ بمورچہ دشمن چھائے چلے

جلاتے تھے۔ جب رات ہوگئی تو مایوس ہو کر بھاگا۔ اندھیرے میں اہل و عیال کہیں کے کہیں جا پڑے۔ صبح ہوتے ان کو بھی بھٹکتا پایا اور احمد آباد کا رخ کیا۔ پہاڑوں اور جنگلوں کی راہ، خود بے سامان، دشمن کے تعاقب کا خطرہ، رستے میں پتا پتا بلا نظر آتا تھا۔ اگرچہ عالمگیر نے پیچھا نہ کیا، مگر پہاڑوں کے بھیل دبانے چلے آتے تھے۔ جب موقع پاتے تھے آن گرتے تھے اور جو پیچھے رہ جاتا تھا اسے نوچ گھسوٹ کر بدن پر کپڑا نہ چھوڑتے تھے۔ غرض آٹھ دن تک گرتا پڑتا برابر چلا گیا۔ اسی عالم میں دیکھا کہ ایک قافلہ دلی کو چلا جاتا ہے اور اس میں ڈاکٹر فرنگی بھی ساتھ ہے۔ دارا کی بی بی زخمی ہوگئی تھی اور حکیم جراح کوئی ساتھ نہ تھا۔ اس بے سر و سامان نے ڈاکٹر صاحب سے خود ملاقات کی اور کہا کہ اس بُرے وقت میں تم ہمارا ساتھ دو تو بندوں کی شکر گذاری کے علاوہ خدا کے ہاں بھی ثواب ہو۔ اس کی بیکسی دیکھ کر مروت نے ڈاکٹر صاحب کو آنکھ نہ پھیرنے دی اور قافلے کو چھوڑ اس کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ تین دن کے بعد جب احمد آباد ایک منزل رہا تو سب خوش ہو گئے کہ کل شہر میں پہنچ کر بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھ جائیں گے۔ گویا اتنی راہ میں رات کو سرائے نصیب ہوئی اور یہی غنیمت ہوا کہ رہزنوں کی آفت سے تو خاطر جمع ہوئی۔ مگر مکان کی قلت اور آدمیوں کی کثرت سے ایسی چپقلش تھی کہ جو بیبیاں کئی کئی ڈیوڑیوں کے اندر محلوں میں بیٹھتی تھیں ان میں اور ڈاکٹر صاحب میں فقط ایک ٹاٹ کا پردہ تھا۔ غرض جوں توں رات کاٹی۔ صبح کو کوچ کی تیاری ہوتی تھی جو ایک شخص نے اندر جا کر کچھ کہا کہ دفعتہً ساری بیبیاں رونے لگیں اور ان کی باتوں سے یہ سمجھ میں آیا کہ احمد آباد کے دروازے بند ہیں یعنی آفت نصیبوں کو اندر جانا نصیب نہ ہوگا۔ اب جان کی خیر اس میں ہے کہ یہیں سے پھریں اور کسی اور طرف کو نکل چلیں۔ اتنے میں دارا شکوہ اندر سے حیران پریشان نکلا۔ سب نے تعظیم دی مگر چپ کھڑے تھے۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ گویا زمین و آسمان میں اُسے کہیں ٹھکانا نہیں نظر آتا اور سوائے مایوسی کے کسی کی آس نہیں۔ دل شکستہ نوکروں سے آبدیدہ ہو کر کہا کہ میں نہیں جانتا مجھ پر اور ان پردہ نشینوں پر ظالموں کے ہاتھ سے کیا کیا کچھ ہونا ہے۔ خیر۔ رفاقت کا وقت ہے۔ یہ حالت اس کی دیکھ کر ڈاکٹر صاحب کے بھی آنسو نکل پڑے۔ غرض اس غم و اندوہ کے دھوئیں سے دل کو خالی کر کے ڈاکٹر صاحب سے بھی رخصت ہوا۔ چار پانچ زنانی سواریوں کے ساتھ دو ہاتھیوں پر چند صندوقچے اور کئی گٹھڑیاں لاد کر سوار ہوا۔

اور چند رفیقوں اور خواجہ سراؤں کو لے کر چلا، مگر لٹیروں کے ہاتھ سے امید نہ تھی کہ چار قدم بھی صحیح سلامت چل سکے۔ بغرض جس رستے آیا تھا انہیں قدموں پھر بھکر کو روانہ ہوا۔

جاتے ہوئے کچھ کے راجہ نے بڑی خاطر کی تھی اور اپنی بیٹی اس کے بیٹے سے نامزد کی تھی، اب کی دفعہ وہ بھی اس بے مروتی سے پیش آیا کہ دنیا کی بے وفائی کی تصویر دل پہ کھینچ گئی اور اس کے پنجے سے نجات پانی غنیمت ہوئی۔ ناچار پھر بھکر کو روانہ ہوا کہ ادھر سے قندھار کی راہ ایران کو نکل جائے، اب فقط گنتی کے خدمت گار اور چند خواجہ سرا عیال و اطفال کے ساتھ تھے اور دریائے سندھ کے کناروں اور سرحد کے پہاڑوں میں ٹکراتا پھرتا تھا، چنانچہ ان ہی پہاڑوں کا ایک سردار بڑے خلوص اور خاطر داری سے پیش آیا اور وعدہ کیا کہ قندھار تک خود جا کر پہنچا آئے گا، مگر ملک جیون نام ایک افغان ادھر کا سردار تھا کہ شاہجہان نے ایک دفعہ اُسے ہاتھی کے پاؤں سے کچلوانے کا حکم دیا تھا اور دارا شکوہ نے اسے بچایا تھا۔ اس وقت میں اُس کے خط پہنچے۔ دارا کو پھر لالچ آیا کہ شاید اس کی مدد سے یہیں کچھ بات بن جائے۔ چنانچہ بے تکلف اس کے گھر چلا آیا، وہ بڑی تعظیم و تواضع سے پیش آیا، یہ فلک آوارہ اس کے دل کی دغا سے بے خبر تھا، بے تکلف رہنے لگا کہ چند روز بیٹھ کر دم لے یہاں سے، مگر قسمت کی سرگشتگی کب ٹھہرنے دیتی تھی۔ جس پیاری بی بی کے سوا کوئی غمخوار رفیق نہ رہا تھا، ان دکھوں کا وہ بھی ساتھ نہ دے سکی۔ یعنی مصیبتوں کے علاوہ کئی مہینے جو بیماری کے دکھوں میں مبتلا تھی جان دے کر عذابِ دنیا سے چھوٹ گئی، دارا کو نہایت رنج ہوا۔ دل زندگی سے بیزار ہو گیا اور رہے سہے ہوش و حواس بھی جاتے رہے۔

چنانچہ جو جاں نثار ایسے وقتوں کے رفیق تھے انہیں جنازے کے ساتھ کر کے لاہور بھیجا کہ اپنے پیر یعنی میاں میر صاحب کی خانقاہ میں دفن کریں، اس وقت اس آفت زدہ کو اکیلا دیکھ کر ملک جیون کی بدنیتی پھوٹ بہی اور فوراً گرفتار کر لیا۔ بادشاہی کاردار سرحد پر موجود تھے انہیں خط لکھ بھیجے اور انہوں نے بادشاہ کو عرضیاں کیں، چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی کی گرفتاری کی خبر سن کر شادیانے بجوائے اور ملک جیون کے لئے خلعتِ بیش بہا اور بختیار خاں کا خطاب بھیج کر حکم دیا کہ جلدی لے کر حاضر ہو۔ دارا بیچارا معہ عیال و اطفال پاؤں میں زنجیر ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنے اسی وقت روانہ ہوا، جب شہر ایک منزل رہا تو بادشاہ نے ایک معتبر خاص بھیجا کہ جا کر خود دیکھ آئے اور نئے حکم پہنچائے۔ چنانچہ دوسرے دن اسی ہدایت کے

بموجب شہر میں لائے۔ ایک ہتنی کہ جس کی پیٹھ پر عماری تک بھی نہ تھی اس پر وہ قیدی طوق و زنجیر میں مسلسل تھا۔ بیٹا برابر بیٹھا تھا اور خدا کی قدرت کو دیکھتا تھا کہ یہ کونسا شاہجہان آباد ہے اور آج اس میں میرا کیا حال ہے۔ شہر کے لوگ بازاروں میں کھڑے زار زار روتے تھے اور دم نہ مار سکتے تھے۔ چنانچہ تمام شہر میں پھرایا اور پُرانی دلی میں لے جاکر قید کر دیا۔ دوسرے دن بختیار خاں بد بخت بھی اپنے حسنِ خدمت کے انعام کے لئے دربار میں حاضر ہوا۔ جوں ہی شہر میں قدم رکھا ہزاروں آدمی کوٹھوں اور دکانوں پر کھڑے ہو گئے اور چاروں طرف سے لعنت پھٹکار کا غل ہوا۔ جوتیاں ٹھیکرے خاک مٹی جو کچھ جس کے ہاتھ میں آیا برسانے لگے اور اس قدر پل کر گرے کہ کئی ہمراہی اس کے پامال ہو گئے بلکہ اگر کوتوال نہ آ پہنچتا تو لوگ بد بخت خاں کی بوٹیاں اُڑا دیتے۔

داراشکوہ نے اس عالم میں ایک رقعہ اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجا، جس کا ترجمہ یہ ہے۔

رقعہ۔ برادرِ من بادشاہِ من سلامت سلطنت تمہیں اور تمہارے بچوں کو مبارک ہو۔ مجھے اب کچھ ہوس نہیں رہی فقط ایک گوشۂ عافیت اور ایک لونڈی[1] خدمت گار چاہتا ہوں کہ لقمہ کھا کر پانی کا گھونٹ پیوں اور تمہارے لئے دعا کرتا رہوں۔ والدعا۔ بادشاہ بھائی نے اس کے جواب میں کیا تو یہ کیا کہ علماء کو بلا کر چند رسالے اور کتابیں جو اس نے علمِ تصوّف میں تالیف و ترجمہ کروائی تھیں وہ پیش کیں اور پوچھا کہ جس شخص کا یہ اعتقاد ہو اس کے لئے شرع میں کیا حکم ہے۔ انہوں نے کہا کہ ان کے مضامین شریعت کے خلاف ہیں جس مسلمان کا یہ اعتقاد ہو اس کا قتل واجب ہے۔ چنانچہ اپنے نزدیک یہ حجتِ شرعی قائم کی۔ مگر معلوم ہوا کہ کوئی شخص اس مظلوم کا قتل قبول نہ کرے گا۔ ایک سنگ دل اپنی عداوتِ ذاتی سے اس کے لہو کا پیاسا تھا اسے حکم دے کر چند ظالموں کے ساتھ بھیجا۔ دونوں باپ بیٹے اس ویران گھر میں بیٹھے مسور کی دال پکا رہے تھے۔ بلکہ اس عالم میں زہر کے خوف سے اکثر وہی کھایا کرتے تھے۔ گو سپندوں نے اپنے قسائیوں کو سامنے آتے ہی پہچان لیا۔ لیکن تیموری ہونے اس وقت بھی بے کسی سے خاک میں ملنا گوارا نہ کیا۔ ایک چھوٹی سی چھُری باورچی خانے میں پڑی تھی، وہی اٹھالی اور جب تک کہ ظالم چاروں طرف سے

[1] یعنی مرد خدمت گار بھی مطلوب نہیں کہ تم کسی سے سازش دوڑانے کا خیال کرو ۱۲

نہ آن گرے تب تک وہ بھی نہ گرا ر آخر زخموں سے چُور ہو کر مارا گیا اور مرکر بھی کوچہ و بازار میں تشہیر ہُو۔ بلکہ جن لوگوں نے بختیار کے ہمراہیوں کو پامال کیا تھا ان پر بھی خلیفۃ اللہ کی مخالفت کا جرم ثابت کر کے مارا اور رعب اپنا لوگوں کے دلوں پر قائم کیا ؎

اے سکندر نہ رہی تیری بھی عالمگیری
کتنے دن آپ جیا جس لئے دارا مارا

بڑے بھائی کا تو یہ حال ہوا مراد بخش چھوٹے بھائی کا حال سنو کہ گوالیار کے قلعہ میں قید تھا۔ معلوم ہُوا کہ اس کا ارادہ بھاگنے کا ہے۔ اسے وہاں سے طلب کیا اور قتل کا سامان اس طرح طیار کیا کہ مراد بخش کو دکن سے چلتے وقت ایک خدمت گار پر سازش کا شبہ ہوا تھا اور اظہاروں کے وقت اس نے بہت گستاخی سے جواب سوال کئے تھے چونکہ میدان جنگ کا سامنا تھا اور موقع نازک تھا اس لئے اسے مروا ڈالا تھا۔ اب اس کا بیٹا دربار میں مدعی بن کر پیش ہو۔ چنانچہ بادشاہ عادل نے اس نامراد بھائی کو گوالیار سے بلا لیا اور قصاص کے حکم سے اطلاع بھیجی۔ اس نے جواب میں کہلا بھیجا کہ مرنے سے میں نہیں ڈرتا مگر جس وقت قتل کا حکم دیا تھا تو میں حاکم با اختیار تھا بلکہ تم نے بھی مجھے بادشاہ مانا ہُوا تھا اور حاکمِ با اختیار اپنی مسند حکومت پر جو حکم تجویز کرے اگر اس کی رائے درست ہے تو بارگاہ الٰہی میں دو ثوابوں کا مستحق ہے اور اگر خطا پر ہے تو ایک ثواب کا حاکم پر کسی شرع اور قانون میں اس طرح قصاص مجرمانہ نہیں آیا۔ اورنگ زیبی عدالت میں یہ عذر بے جا متصوّر ہو کر حکم قتل کا جاری ہُوا اور وہ نامراد نوجوان اپنے نامہربان بھائی کے حکم سے مارا گیا۔

شجاع نے اگرچہ بہت دفعہ شجاعت دکھائی مگر ہر دفعہ شکست کھائی جب اورنگ زیبی فوج برابر دبائے چلی گئی اور کسی طرح پیچھا نہ چھوڑا تو ناچار ہٹتا گھٹتا اراکان کے راجہ کے پاس چلا گیا اور وہاں جا کر مفقود الخبر ہو گیا ؛

عالمگیر کا لشکر دکن پر جاتا ہے

ملکِ دکن کے اضلاع اکبر کے عہد میں بھی خراج دینے لگے تھے۔ شاہجہان نے اپنی حکومت کو ان میں زیادہ تر زور دیا تھا اور خود عالمگیر ہی اس وقت بھی فوج لے کر گیا تھا۔ اب جو سب طرف سے خاطر جمع ہوئی اور دیکھا کہ جواہرات کی کانوں اور سمندر کی بندرگاہوں سے اس زرخیز ملک میں روپیہ کی بڑی کثرت ہے چاہا کہ اپنی عالمگیری کو وہاں پورا کرے۔ اس واسطے اس کے لینے کا ارادہ کیا اگرچہ ریاستیں وہاں اور بھی بڑی بڑی تھیں۔۔۔ مگر ابوالحسن تاناشاہ حیدرآباد اور گولکنڈہ کا حاکم بڑا صاحب اقتدار اور عالی دماغ بادشاہ تھا۔ ساتھ اس کے خوش مزاجی اور نیک نیتی سے رعیت بھی اسے نہایت عزیز رکھتی تھی۔ چونکہ بادشاہ مذکور عالمگیر کے ساتھ بھی عہد و پیمان پر صدق دل سے قائم تھا اس لئے سردست کچھ بہانہ ہاتھ نہ آیا۔ آخر ایک جان نثار خاص کو روانہ کیا اور پیغام یہ بھیجا کہ سنا ہے ایک الماس نہایت نایاب تمہارے جواہر خانے میں ہے، وہ بادشاہی جواہر خانے میں داخل کرو۔ امیر مذکور کو خلوت میں یہ بھی سمجھا دیا کہ غرض اس وکالت سے فقط لڑائی کا بہانہ پیدا کرنا ہے اس لئے تمہیں بھیجا جاتا ہے کہ تاناشاہ کی ہر ایک بات پر نظر رکھنا اور جس طرح ہو تکرار کے بڑھانے میں کوشش کرنا بلکہ اس طرح بیباکی اور گستاخی کی باتیں کرنا جن کا تاناشاہ متحمل نہ ہو سکے اور کسی طرح لڑائی کے لئے ایک سبب معقول پیدا ہو جائے۔ امیر مذکور وہاں گیا تو تاناشاہ نے نہایت تعظیم و تکریم سے استقبال کیا اور بڑی دھوم سے مہمانداری کی۔ جب اس نے الماس کے باب میں کہا تو اپنے جواہر خانے کے داروغہ کو بلا کر تمام جواہرات مع فرد کے سامنے رکھ دیئے بلکہ قسمیہ کہا کہ ان جواہرات کے سوا میرے پاس کوئی الماس نہیں ہے اور جو کچھ یہاں ہے بندگان عالی کا مال ہے۔ انہیں دیکھ کر جو اعلےٰ سے اعلےٰ رقم ہو وہ لے لو۔ چنانچہ ایک قطعہ الماس اس نے لے لیا مگر جب تک وہاں رہا کوئی موقع بگاڑ کا نہ ہاتھ آیا۔ چونکہ وکالت کی اصل خدمت یہی تھی اس نے سر دربار سخت سخت کلام کرنے شروع کئے۔ پھر بھی تاناشاہ ایسے معقول جواب دیتا تھا کہ یہ بند ہو جاتا تھا اور کوئی بات ایسی نہ ہوتی تھی جس پر

گرفت کر سکے۔ چنانچہ ایک دن تانا شاہ نے اثنائے تقریر میں کہا اگرچہ ہم بھی بادشاہ ہیں مگر اپنے تئیں عالمگیر بادشاہ کے نوکروں میں جانتے ہیں۔ امیر مذکور نے بگڑ کر کہا کہ عالمگیر بادشاہ کے نام کے ساتھ اپنے لئے بادشاہی کا نام لینا آپ کو نہیں چاہیئے۔ ابوالحسن نے ہنس کر کہا کہ نہیں تمہاری غلطی ہے اگر ہم بادشاہ نہ ہونگے تو عالمگیر کو شہنشاہ کون کہے گا۔ آخر باوجود ان سب بانوں کے شہنشاہ ہوس پناہ نے فوج کشی کے سامان کر دیئے۔ لیکن اکبر کے آئین اور جہانگیر کی خوش مستیوں نے عہدِ شاہجہان کے امن و امان میں پرورش پا کر عجیب و غریب رنگ پیدا کئے تھے یعنی سلطنت کی شان و شوکت کے ساتھ فوج کا ڈھنگ بدل گیا تھا چنانچہ جب دیکھنے والے انہیں دیکھ کر تیموری اور بابری سواروں کا اور ان کی بگٹوٹ یلغاروں کا خیال کرتے تھے تو تعجب آتا تھا۔ لشکر کے ادنیٰ ادنیٰ رسالہ دار کا یہ عالم تھا کہ اس کے ساتھ رسالہ ایک دولہا کی برات معلوم ہوتی تھی۔ خیال کرنا چاہیئے کہ ایک ایک شاہزادے کا اور خود بادشاہ کی سواری کا کیا عالم ہوگا۔ غرض لشکر شاہی نے نشان چڑھایا اور دکن کو روانہ ہوا۔ سب سے پہلے ایک ہاتھی پر علم اژدہا پیکر، پیچھے اس کے ہاتھیوں پر ہندوستان کا ماہی مراتب اپنی ولایت کے طوغ و علم بجتی اور فولادی نقارے اور ان کے بعد ان کے ہزار دل ہاتھی ہودج عماری سے سجے۔ سونڈوں میں فولادی زنجیریں لئے، گلے میں ہیکلیں، پیشانیاں شام شفق کی طرح رنگین۔ اس پر سنہری رُوپہلی ڈھالیں، زربفت کی جھولیں پاؤں تک لٹکتی۔ کسی پر ہودج کسی پر عماری، ریشمی اور کلابتونی رسوں سے کسی گردنوں پر مہاوت جن کے گلے میں زربفت کی کُرتیاں سر پر جوڑے دار پگڑیاں کمر میں کٹار۔ ایک ہاتھ میں گجباگ ایک میں آنکس جھومتے جھامتے چلے جاتے تھے۔ آگے پیچھے چوکڑے سانٹے مار، بھالے بردار، برچھیت، بانذار، فیلے سلگاتے بھاگے جاتے تھے۔

پھر ہزاروں سواروں کے پرے، سر سے پاؤں تک لوہے میں ڈوبے بہادر نوجوان ترک بچے تا افغان، حبشی، راجپوت، دو دو تلواریں باندھے، فولادی خود سروں پر دھرے، کمر میں قرولی اور کٹار، پشت پر گینڈے کی ڈھال۔ چار آئینہ سجے، کہنیوں تک دستانے چڑھے، ہاتھوں میں سات گز کا برچھا، نگاہوں سے خون ٹپکتا، موچھوں کو تاؤ دیتے۔ گھوڑے اڑاتے چلے جاتے تھے۔ پھر ہزاروں سانڈھنیاں خوش رفتار کہ جن کے سو سو کوس کے دم ان پر ناگے راجپوت لال پگڑیاں باندھے، زرد انگرکھے پہنے آبی بانات کے

پاجامے چڑھائے ہتھیار لگائے مہاریں اٹھائے جب یہ گذر گئے تو سواری کے ٹھاٹ نظر آئے۔ عربی، ترکی، عراقی، یمنی، کاٹھیاواڑ کے دکنی چاندی سونے کے بھاری بھاری ساز کسی پر جڑاؤ زین دھرا، کسی پر چارجامہ کسا، قجر یاب اور پاکھر پیٹھوں پر پڑیں، جن میں قاقم وسمور کی جھالر، کلابتوں کے پھندنے، گلے میں سراگاے کی چوریاں ٹکتی، سر پہ کلغیاں طلائی اور نقرئی، ریشمی باگڈوریں سائیسوں کے ہاتھ میں اُلیل کرتے اور چوکڑیاں بھرتے جاتے تھے ان کے بعد عربی، رومی، تاتاری، فرنگی، ہندی باجے، نقیبوں اور چوبداروں کے آوازے دمامے کی چوٹ کے ساتھ کڑکیتوں کے کڑکوں کا وہ سماں بندھا ہوا کہ بزدلوں کے دلوں میں بھی جوش مارنے لگے۔ ان کے بعد احدیوں اور خواصوں کا انبوہ، کندھوں پہ بندوقیں جن پر بانات کے غلاف۔ پھر خاص برداروں کا غول، سروں پر کشمیری شالیں بندھی کمخواب کے انگرکھے۔ زربفت کی نیما آستینیں پہنے، گجراتی مشروع کے گھٹنے چڑھائے اصفہانی تلواریں سونے مرصع قبضے ہاتھ میں، سنہری رُوپہلی ہمیان کمر میں، اُن کے بعد سقوں کا غول آیا کہ چھڑکاؤ سے روئے زمین کو تروتازہ کر دیا۔ غلام اور خواجہ سرا انگیٹھیاں اور عود سوز لئے خوشبوؤں سے دماغ معطر کرتے چلے گئے۔ پھر ارکانِ دربار کے جمگھٹ، بیچ میں شاہ خورشید کلاہ سفید داڑھی، بڑھاپے کا نور منہ پر، ہوادار میں سوار۔ ساتھ ایک خاصے کا گھوڑا پیچھے سونے کی عماری ہاتھی پر دھری۔ جریب کا پیمانہ اور کوس کا پیا پڑتا چلا جاتا ہے تا سواری سے کوس بھر پیچھے سینکڑوں ہاتھی مست، جنگی دیوزاد کی صورت مستکوں پہ فولادی ڈھالیں۔ ایک کالی گھٹا چلی آتی تھی کہ جس سے بجائے پانی کے مستی ٹپکتی تھی۔ پیچھے چیتوں کے چھکڑے، آنکھوں پہ زردوزی دبدہ بند، کمر میں کلابتونی اور ابریشمی حلقے پڑے، ساتھ ہی شکاری کتے تازی، ولائتی، بوداد، بلڈوگ کہ شیر کا سامنا کریں اور پلنگ سے منہ نہ پھیریں۔ پیچھے کوسوں تک شاہ زادوں اور ارکانِ دولت کے لشکر۔ راجوں اور مہاراجوں کی فوجیں، پیادوں کے غول اور سواروں کے رسالے، رنگارنگ کے نشان جدا جدا پھریرے اُڑاتے چلے آتے تھے۔ بہیر بنگاہ کا تانتا لگا تھا کہ جس کا صبح سے شام تک خاتمہ نہ تھا۔

غرض[1] کہ شاہ خوش نصیب نے پہلے شاہ زادوں کو روانہ کیا انہوں نے جا کر سرحد کے

[1] یہ حالات سیر المتاخرین اور خافی خاں کی تاریخ سے لئے گئے۔

قلعوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کی اور بیجاپور اور حیدر آباد پر بھی فوجیں گئیں۔ دکنی جان ایک ایک قلعہ اور گڑھی پر ایسے جان توڑ توڑ کر لڑتے کہ بادشاہی سپاہ کے جی چھوٹ چھوٹ گئے اور اورنگ زیبی تدبیریں اور ان کے جاسوسوں کی تحریریں کچھ کام نہ کر سکیں۔ یہ باہر سے بہتیرے بنا وبست کرتے مگر وہ بہادرانہ حملوں اور دلاورانہ مقابلوں سے ایسی ایسی زکیں دیتے کہ بادشاہ کے قدیمی جاں نثار اور بڑے بڑے سپہ دار ندامت پر ندامت اٹھاتے۔ آخر محاصرے سے تنگ ہو کر حاکم بیجاپور نے اطاعت اختیار کی۔ اور حیدر آباد اور گولکنڈہ کی نوبت آئی۔ عالمگیر عقل و تدبیر میں سکندر کو اور شجاعت میں رستم و اسفندیار کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور اخبار نویسوں کے بھروسے یہ سمجھے ہوئے تھے کہ کوئی بات مجھ سے مخفی نہیں۔ چنانچہ کسی سردار پر بزدلی کا الزام، کسی امیر پر بے لیاقتی کا جرم قائم کیا بلکہ جن نمک حلالوں نے حد سے زیادہ جاں نثاریاں کی تھیں۔ انہی کو سازش کی تہمتیں لگائیں۔ انتہا یہ کہ ولی عہد سلطنت کو معہ اس کی بی بی کے ادنیٰ گنہگاروں کی طرح قید کیا۔ غسل اور حجامت تک بند کر دی اور زیور ظروف کی اسباب سب چھین لیا۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ طرفِ ثانی آخر مسلمان تھے اور چونکہ یہ لڑائی بادشاہ نے فقط شوقِ طبیعت اور وسعتِ سلطنت کے اشتیاق میں اٹھائی تھی اس میں لاکھوں مسلمانوں کا خونِ ناحق بہنا کسی کو بھلا نہ معلوم ہوتا۔ غرض بادشاہی لشکر اور سلطنت کے سامان کے سامنے ایک صوبے کی کیا بساط ہے: برسوں کا طول کھنچ گیا۔ چنانچہ اس عرصے میں بعض قلعے فتح ہوئے۔ بعض کے محاصرے سالہا سال تک قائم رہے۔ آخر خود بدولت پہنچے اور تدبیروں کے جال پھیلانے شروع کر دیئے۔ چونکہ لڑائی میں ایسے کام کرنے کچھ فریب نہیں بلکہ سپاہیانہ پیچ ہیں۔ اس لئے سازش کے سلسلے دوڑا کر ابوالحسن کے نوکروں کو توڑنا شروع کیا۔ بہت سے اُدھر کے بے وفا ادھر آ گئے۔ شاہ مصلحت پناہ نے ان کے دل بڑھانے اور درجے چڑھانے کے لئے پنجہزاری اور ہفت ہزاری منصب داروں کو موقوف کیا اور موروثی کاردار بے کار کر دیئے۔ غرض انواع و اقسام کی تدبیریں اور رنگا رنگ کی تجویزیں ہوتی تھیں لیکن چونکہ حق دار کا حق بھی ایک قوی زور رکھتا ہے، اس لئے فتح کی صورت نہ دکھائی دیتی تھی بلکہ ہر بات میں ندامت حاصل ہوتی تھی۔ ایک دفعہ مبہت سے مشورے اور گفتگو کے بعد یہ ٹھہری کہ خان فیروز جو اُن دنوں میں بڑی چلتی تلوار نکلا تھا، رات کو شبخون کرے اور کمندیں ڈال کر قلعے پر چڑھ جائے۔ چنانچہ وہ ایک شب

بڑے بڑے جانباز سپاہیوں کو ساتھ لے کر رات بھر اندھیری رات کی چادر میں چھپا رہا۔ صبح ہوتے کمندیں اور زینے لگا دیئے اور جب سپاہی ان پر چڑھنے لگے تو حاجی محراب مقربِ خاص کہ اکثر معاملوں میں خفیہ نگہداشت اس کا کام تھا، ان کی کارگزاری دیکھنے کے لئے کہیں لگا ہوا تھا۔ وہ اسی وقت دوڑا ہوا آیا۔ بادشاہ ابھی سجادہ پر تھے کہ دُور ہی سے مجرے سلام مبارک باد کے کرنے لگا۔ یعنی فوج قلعہ پر چڑھ گئی۔ بادشاہ بھی باوجود اپنی تمکنت و وقار کے خوشی کے مارے اٹھ کھڑے ہوئے اور اشارہ کیا کہ ہون یعنی فتح کے شادیانے کیوں نہیں بجاتے۔ ساتھ ہی پوشاک پہن کر سواری منگائی اور خود تماشا دیکھنے کو تیار ہوئے۔ تمام آس پاس کے لوگ آتے تھے اور آداب تسلیمات بجا لا کر مبارک بادیں دیتے تھے۔ اتنے میں خبر آئی کہ منصوبہ اُلٹا پڑا اور جان نثاروں کو بڑی چشم زخم پہنچی۔ صورت یہ ہوئی کہ برجوں کے پہرہ دار اُن کی آہٹ سن کر ہوشیار ہو گئے۔ مگر دغاباز چپکے بیٹھے رہے بلکہ ہتھیار لگا لئے اور لوہے کے پنجے ہاتھوں پر چڑھا لئے۔ جوں ہی نیچے والوں نے فصیل سے سر نکالا انہوں نے پہلے ہی وار میں پگڑیاں اور خود اڑا دئے بعد اس کے سر گھسوٹ اور منہ نوچ کر اس طرح دھکیلا کہ اوپر والوں نے اپنے نیچے والوں کو لیتے ہوئے زمین پر آ کر دم لیا۔ جو زندہ رہے خراب خستہ لوٹتے پیٹتے ڈیروں میں آئے۔ مگر ایک کی صورت نہ پہچانی جاتی تھی۔ بادشاہ کے نمک حلال اخبار نویس اور معتبر جاسوس جن پر کل کاروبار کا دارومدار تھا، انہوں نے اس حملے کے بگڑ جانے کی اصل دریافت کر کے حقِ نمک ادا کیا۔ اور لکھا کہ دلیروں کی دلیری میں تو کچھ شک و شبہ نہیں مگر حقیقت میں فصیل پر ایک کتا بیٹھا تھا وہ ناپاک ان کی آہٹ سن کر بھونکنے لگا کہ پہرہ دار جاگ اٹھے۔ نہیں تو قلعے کے فتح ہو جانے میں کچھ باقی نہ تھا۔ چنانچہ ابوالحسن اس کتے کی نمک حلالی سے بہت خوش ہوا۔ سونے کی ہنسلی اور زنجیر گلے میں پہنا کر زربفت کی جھول کا خلعت دیا ہے اور وہ منصب و خطاب عطا کیا ہے کہ تمام منصب دار اس سے رشک کرنے لگے ہیں۔ چونکہ ایسی ہی خبریں حضور میں تدبیر سلطنت کی راز سمجھی جاتی تھیں۔ اس لئے شاہ باتدبیر نے بھی اخبار نویس کو خوشنودیِ مزاج کا پروانہ لکھا۔

ایک دن بہت مینہ برسا۔ قلعے کی فوج اسی عالم میں نکلی اور اس دلاوری سے حملے کئے کہ مورچالوں کے دھوئیں اڑا دیئے اور بارہ نامور منصب داروں کو پکڑ کر لے گئے تاناشاہ نے کئی دن انہیں مہمان رکھا اور غلہ اور رسد کے سامان جو انبار در انبار بھرے پڑے تھے

سب دکھائے۔ بعد اس کے خلعت دے کر رخصت کیا اور بادشاہ کے لئے عرضی بھیجی۔
خلاصہ اس کا یہ تھا کہ اختیار یا بے اختیاری سے جو کچھ خطا ہوئی فدوی اس کی سزا کو پہنچا۔ اب امیدوار معافی کا ہوں اور قلعے کا حال یہ ہے کہ اگر حضور نے فتح کیا تو آخر یہ پامالی ملک کسی جان نثار کو عطا کر کے تشریف لے جائیں گے وہ جاں نثار آپ فدوی ہی کو تصور فرمائیں۔ حضور پر روشن ہے کہ لشکر منصور کے اس قدر قیام کرنے سے یہ ملک آشیانہ چغد و بوم سے بدتر ہو گیا ہے جس کو آپ مقرر کریں گے وہ اپنے اور اپنے منصب داروں اور فوج اور دفتر کے لئے سال ہا سال تک یہاں کی آمدنی کے علاوہ لاکھوں روپیہ خزانہ شاہی سے لے گا۔
میں اپنا اخراج معمولی بدستور دیتا رہوں گا اور اس کے علاوہ جب آپ تشریف لائیں تو ہر کوس پر لاکھ روپیہ داخل کروں گا بلکہ جتنی دفعہ کہ اب تک حضور مورچے پر آئے اور گئے یا ادھر کی سمت کو قدم رنجہ فرمایا ہے اس کے شکریے میں معمولی نذرانہ الگ حاضر کروں گا۔ یہ سب باتیں فقط اس لئے ہیں کہ طرفین کے مسلمان اور بندگان خدا ناحق نہ مارے جائیں اور حضور کی سپاہ کے لوگ جو برسوں سے گھر کو ترس گئے ہیں بے عیال و اطفال کی جدائی کا رنج نہ اٹھائیں اگر یہ عرض بھی قبول نہ ہو تو اتنی اجازت ضرور ہو کہ پانچ چھ لاکھ من غلہ جو جلال غلام نمک حلال حضور کا خود دیکھ گیا ہے وہ لدوا کر بھیجدوں کیونکہ سنتا ہوں حضور کے لشکر میں رسد کی طرف سے بڑی تکلیف ہے۔
تمام لشکر جو کئی برس سے یہاں پڑا تھا اس مضمون کو سن کر خوش ہو گیا اور تاناشاہ کی تعریفیں کرنے لگا مگر بادشاہ نے اس کا جواب کچھ نہ لکھا۔ ہاں زبانی بہت سی باتیں کہیں۔
خلاصہ ان کا یہ تھا کہ اگر فرمان بردار بنا ہے تو دروازے کھول دے کہ ہمارے آدمی جائیں اور طوق و زنجیر پہنا کر لے آئیں بلکہ برخلاف اس کے برار کے حاکم کے نام حکم بھیجا کہ پچاس ہزار تھیلے ٹاٹ کے بھیجدو کہ دوبارہ خندق کو بھر کر قلعے پر حملہ ہو۔ اہل فوج سن کر کہنے لگے کہ کاش تاناشاہ کا پانچ لاکھ من غلہ آنے دیا ہوتا کہ بھوکوں کی جانیں بچ جاتیں اور تھیلے خندق کے کام آتے۔
لشکر کے دل شکستوں کے دل بڑھانے کے لئے ایک دن خود بدولت نے وضو کر کے نماز پڑھی اور سجادے پر بیٹھ کر پہلا تھیلا دست مبارک سے سیا اپنے ہاتھ سے اس میں خاک بھری اور حکم دیا کہ پہلے اسے خندق میں ڈالیں اور ساتھ ہی سرنگیں لگانی شروع

گیں۔ چند روز کے بعد ایک دن رپٹ گزری کہ سرنگیں تیار ہو گئیں اور بارود فتیلے سب درست ہیں اسی وقت حکم پہنچا کہ بہیر بنگاہ کے لوگ رات کو قلعے کے پیچھے جا کر چھپ جائیں اور صبح ہوتے ہی خوب دلیرانہ غل مچائیں تاکہ قلعے والے ادھر فصیل پر جھکیں اور یہاں سرنگوں کو آگ دکھائی جائے۔ چنانچہ اسی وقت حکم کی تعمیل ہوئی اور دوسری طرف کو تمام فوج ہتھیار سجا کر حملے کو تیار کھڑی ہو گئی۔ مگر جب فتیلوں کو آگ دی تو سرنگ باہر کی طرف سے اڑ کر رہ گئی اور مصیبت یہ ہوئی کہ جو خاک پتھر اڑے وہ ادھر ہی آئے۔ چنانچہ لشکر منصور کے صدہا بہادر اور نامی منصب دار ضائع ہو گئے۔ آخر بادشاہی جاسوسوں نے پھر حقِ نمک ادا کیا اور سراغ نکالا کہ قلعہ والوں کو خبر ہو گئی تھی وہی چوٹے اندر سے سرنگیں توڑ کر بارود چرالے گئے اور نہر کاٹ کر پانی ادھر توڑ دیا۔ چنانچہ باہر کا حصہ خشک باقی تھا وہ اڑ گیا۔ یہی سبب تھا کہ ملبہ اس کا ادھر ہی زور کر کے آیا اور لشکر کے بہادروں کو تباہ کیا۔ یہاں بادشاہی مورچوں کے لوگ قلعے کی دیوار کی طرف حیران دیکھ رہے تھے کہ کب گرے اور ہم آگے بڑھیں۔ اندر سے قلعے کی فوج بھی آن گری۔ اور مار مار کے مورچوں میں ایک قیامت برپا کر دی۔ آخر بہت سی جانیں دیں اور ان سینہ زوروں سے پیچھا چھڑایا۔ ادھر تو ابھی مُردوں اور مجروحوں کو سنبھال رہے تھے کہ دوسرے سردار نے اپنی نقب کو آگ دے دی۔ وہاں بھی دغا باز اپنا کام کر گئے تھے۔ وہ نقب جس قدر اڑی اس سے بھی آفت برسی اور پہلے سے بھی دو چند بہادروں کا خون ہوا۔ یہ حال سن کر قہر بادشاہی کے دریا میں طوفان آیا اور خود ہوادار[1] پر سوار ہو کر موقعے پر آئے اور دھاوے کا حکم دیا۔ بے ادب گستاخوں نے بادشاہ کا بھی خیال نہ کیا۔ ایسی توپیں ماریں کہ کئی گولے چترِ شاہی پر تصدق ہوئے اور کئی پاؤں میں گرے۔ برابر سے ایک خواص کا ہاتھ اڑ گیا۔ اس پر بھی شاہ مستقل مزاج شوقِ فتح میں برابر حملے کا حکم دیئے جاتا تھا۔ مگر غضب یہ ہوا کہ بارانِ بے محل آسمان سے نازل ہوا۔ اس نے سارا کام مٹی کر دیا کہ توپ بندوق سے لے کر کمان تک سب بے کار ہو گئی۔ وہ دمدمے جو لاکھوں روپیہ اور ہزاروں آدمی کی جانفشانی سے تیار ہوئے تھے سب بیٹھ گئے اور جو تھیلا حضور نے بعد نماز کے باوضو سیا تھا وہ بھی بہہ گیا۔ سواری خاصہ کا ایک ہاتھی کہ مصوروں نے چالیس ہزار روپے اس کی قیمت آنکی ہوئی تھی، وہ بھی ساتھ تھا، گولا کھا کر بھاگا اور کیچڑ میں پاؤں پھسل کر

---

[1] ایک شاہانہ سواری کا نام ہے۔

حضور کے سر پر قربان ہُوا۔ اتنے میں قلعے والے باغی پھر شیر ہو کر اندر سے نکلے۔ حضور فوج کو سنبھال کر نہایت شجاعت اور کمال احتیاط سے پیچھے ہٹے۔ مگر انہوں نے دمدموں پر آ، توپیں اور بہت سا سامان جو ہزار مشکل سے وہاں تک پہنچایا تھا آسان لے لیا اور خاطر جمع سے قلعے میں چلے گئے۔ توپیں جو چل سکیں وہ لیں، باقی میں میخیں مار گئے۔ دوسرے دن پھر حضور سوار ہوئے اور بہادر حملے کے لئے تیار ہوئے۔

ایسی ایسی باتوں سے جب بادشاہ بہت تنگ ہوئے تو ابوالحسن تاناشاہ کی عملداری کی خلافِ شرع باتوں سے ناراض ہو کر حیدرآباد کا نام دارالجہاد رکھا اور جنگِ دین کی نیت سے لڑائی شروع کی۔ مگر اپنے لشکر اسلام کے لوگ ایسے بداعتقاد تھے کہ خلیفۃ اللہ کے فتویٰ پر ذرا خیال نہ کرتے تھے بلکہ جہاد تو در کنار لڑنا گناہِ محض سمجھتے تھے، جو اُدھر کے لوگ اِدھر لوٹ کر آتے تھے اور انہیں تالیفِ قلوب کے لئے عہدے ملتے تھے، اسے اپنی حق تلفی سمجھتے اور جو قحط اور بے سامانی اور اہل و عیال کی جدائیوں سے تکلیفیں ہوتی تھیں، انہیں بادشاہ کی بے تدبیری کہتے تھے اور جب اپنی جانفشانی اور حملے ناکام ہوتے تو بادشاہ کی بدنیتی خیال کرتے تھے۔ اگر بادشاہ سازش کی احتیاط کر کے ان کا عہدہ گھٹاتا تو باوجودیکہ خانہ زادِ قدیم تھے، پھر بھی برا مانتے تھے اور آپس میں شکایتیں کرتے تھے بلکہ اس کی بدتدبیریوں پر مل مل کر ہنستے تھے۔ مگر اس پر بھی خود بادشاہ اور اس کے سردار باوفا تدبیر کے رستے میں بال بھر بھی کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ اور سامانِ جنگ کے ساتھ عاملوں اور ساحروں کے عمل بھی کام میں آتے تھے۔

ایک قلعے کو فوج شاہی گھیرے ہوئے پڑی تھی۔ کوئی مکار عامل بن کر لشکرِ شاہی میں آیا اور تسخیرِ کواکب کے دعوے سے قلعے کے فتح کروا دینے کا بیڑا اٹھایا۔ سپاہ اور سپہ سالار بھوکوں کے مارے تنگ آ گئے تھے۔ سب نے غنیمت سمجھا اور اس کی طرف رجوع کی۔ اس نے عجیب عجیب پکھنڈ باندھے اور بڑے بڑے دعوے کئے۔ بموجب اس کے کہنے کے مورچے کے پاس ایک بڑا کٹ گھر تیار ہُوا اور اس متفنی نے ایک موٹا روئی دار دگلہ اور ریشم کا بھرا ہوا چلتا پہنا۔ اس پر دبر کا لبادہ اوڑھا اور ایک زنجیر طلائی کہ وزن میں سوا دو سیر سے کم نہ تھی، ہاتھ میں لے کر بڑے گھمنڈ سے کھڑا ہُوا۔ چند الفاظ بے معنی منتر کے طور پر پڑھنے شروع کئے اور کہہ دیا کہ جس وقت ہم اشارہ کریں اسی وقت حملہ کر دینا۔ اگر چہ

اس جعل ساز نے تیر و تفنگ کا بندوبست پکا کر لیا تھا مگر کوئی ٹھنڈا گولا یا پتھر ایسا آ کر لگا کر خود کٹ گھڑ سے گرا اور گرتے ہی ٹھنڈا ہو گیا۔ آخر دو تین دن کے بعد فتح سے ناامید ہو کر محاصرہ اٹھا لیا۔ چنانچہ سب سردار لباس بدل بدل کر چلے اور چلتے ہوئے کسی نے جل کر اس کٹ گھڑ کو بھی آگ لگا دی۔ قلعہ والے پیچھے دوڑے اور چلّانے لگے کہ اپنے کٹ گھڑ کو تو جل لینے دو۔ اس کی راکھ منہ پر مل کے جانا کہ اچھی طرح صورت بدل جائے۔

یہ سب باتیں تو تھیں مگر بادشاہ با تدبیر نے جو خفیہ سازشوں کی سرنگیں لگائی تھیں وہ سب سے زیادہ کارگر ہوئیں۔ فی الحقیقت ایسی مرد آزمائی کے وقت میں راہِ رفاقت پر ثابت قدم رہنا مردوں کا کام ہے۔ چنانچہ بہت سے نامرد نمک حرام اپنے ولی نعمت کو چھوڑ کر اُدھر سے اِدھر آن ملے اور چونکہ وہ اس ملک کے حالات اور سلطنت کے معاملات سے بخوبی واقف تھے اس نے تانا شاہ کو بے یار و مددگار دشمن کے منہ کا شکار رہ گیا تھا بالکل ضعیف کر دیا۔ باوجود اس کے وہ استقلال کی تصویر اپنی جگہ سے نہ ہلی اور باوفا نمک حلال ان کے اس طرح لڑتے اور جانیں فدا کرتے رہے کہ جانبازی اور جاں فشانی قیامت تک ان کے نام کی قسم کھایا کرے گی۔ مگر ساری مہم کا خون ایک نمک حرام بے ایمان کی گردن پر ہوا۔ یعنی قلعے میں ایک دروازے پر کسی افغان سردار کے ماتحت فوج تھی۔ وہ بے وفا مل گیا اور آقا کا گھر بگاڑ کر آخرت کا ... اپنی گردن پر لیا۔ چنانچہ دن کو بڑے زور سے لڑائی ہوئی اور دن بھر اہلِ قلعہ نے اس زور شور سے فوجِ شاہی کے حملوں کو دفع کیا کہ سب کے منہ پھر پھر گئے۔ شام کو طرفین کے بہادر اپنی اپنی خیمہ گاہوں کو پھرے۔ اس وقت محمد اعظم عزیز فرزند بادشاہ کا اور کئی عمدہ سپہ سالار فوجیں لے کر اسی دروازے کی طرف پہنچے جدھر افغان مذکور کا مورچہ تھا۔ چنانچہ اُس نمک حرام نے چپکے سے دروازہ کھول دیا۔ فصیلوں میں بھی جابجا سوراخ ہو گئے تھے۔ تمام فوجِ شاہی سیلاب کی طرح قلعے میں گھس گئی اور دفعتہً ایک غل اٹھا کہ تمام قلعے میں ہل چل پڑ گئی۔ جو جان باز تمام دن توپ و تفنگ سے سینہ بسینہ رہے تھے پھر دوڑے اور باقی رات اس طرح کی تلواریں مار مار کر کاٹی کہ وفاداری کے چہرے گلزار اور جاں نثاری کے پھول شاداب ہو گئے۔ غرض جب صبح نے رات کا گریبان چاک کیا اور تاروں نے آنکھوں میں آنسو ڈب ڈبا کر دامنِ سحر میں منہ چھپایا تو فتح یابوں نے اور بھی زور دیا اور تانا شاہ کو موت سامنے

دکھائی دی۔ ساتھ ہی حرم سرا سے فریاد و زاری کا غل اٹھا۔ اس وقت دیوانِ خاص سے اٹھ کر گھر میں گیا۔ در و دیوار پر اداسی اور سوگواری برس رہی تھی۔ ہر طرف نظرِ حسرت سے دیکھا۔ ہر ایک کو سامنے بلا کر تشفی اور دلاسا دیا اور ایک ایک سے حق بخشوا کر رخصت ہوا۔ بعد اس کے باہر آیا اور اسی صبر و وقار سے مسند پر بیٹھ گیا۔ خبردار نے خبر کر دی کہ چند سردار فوج عالمگیری کے شاہزادے کے دربار سے اس طرف رخصت ہوئے ہیں۔ چونکہ اس کے کھانے کا بھی وقت تھا اس واسطے بموجب معمول کے بکاول کو حکم بھیجا اور بن بلائے مہمانوں کے انتظار میں توقف کیا۔ باوجود اس کے چہرے پر وہی بشاشت تھی۔ اور تیوری پر بل تک نہ تھا۔ اتنے میں سردارانِ مذکور ہتھیار سجے ننگی تلواریں ہاتھوں میں لئے پہنچے۔ اس صاحبِ اخلاق نے خود سلام علیک میں سبقت کی۔ پھر بھی تانا شاہ تھا۔ بادشاہی آن بان کو نہ چھوڑا۔ یعنی ہاتھ سر پر نہ رکھا۔ مگر نہایت گرم جوشی اور تپاک سے اور آداب ریاست کے لحاظ سے بات کی۔ اس کی نیک نیتی نے ایسا رعب ڈالا کہ وہ بھی کچھ کہہ نہ سکے اور آکر خاموش بیٹھ گئے۔ اتنے میں روز روشن ہو گیا تھا۔ بکاول نے عرض کی کہ خاصہ تیار ہے۔ تب ان سے اجازت چاہی اور انہیں بھی چلنے کے لئے کہا۔ اگرچہ کوئی عالمگیری نمک خوار اجازت کے روادار نہ تھے مگر کچھ انسانیت کے رنگ پر در وہ بھی ان میں تھے۔ چنانچہ انہوں نے اشارہ کیا کہ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا۔ ایسی ادنیٰ بات پر حکومت جتانی تنگ ظرفی معلوم ہوگی۔ چنانچہ کھانے کی اجازت دی اور خود بھی شریک ہوئے۔ ایک سردار نے طعن سے کہا کہ یہ کیا وقت کھانے کا ہے۔ تانا شاہ نے نہایت بے تکلفی سے کہا کہ ہاں میں اسی وقت کھانا کھایا کرتا ہوں۔ اس نے کہا یہ تو میں جانتا ہوں مگر اس حال میں آپ کا جی کھانے کو کیونکر چاہتا ہے۔ جواب دیا کہ البتہ علی العموم تو لوگوں کا یہی حال اور خیال ہے مگر انسان کو خدا پر بھی نظر رکھنی چاہیے جو شاہ و گدا دونوں کا خالق ہے۔ باپ دادا نے نہایت فارغ البالی سے عمر گزاری۔ میں نے چند روز نہایت فقیری اور تنگدستی اٹھائی۔ پھر خدا کی عنایت ہوئی تو اس بے مقدار کو اس درجے پر پہنچا دیا کہ جس کا وہم و گمان بھی نہ تھا یعنی ایک دم میں بادشاہ ہو گیا۔ الحمدللہ کہ اب کوئی آرزو باقی نہیں۔ لاکھوں حاصل کئے اور لاکھوں ہی دیئے۔ عالم سلطنت میں جو ناشائستہ عمل ہوئے اس کی تنبیہ و تادیب کے لئے خداوندِ عالم نے بادشاہت لے لی۔ مگر الحمدللہ کہ

استقلال اور اختیار کا سر رشتہ اسی طرح میرے ہاتھ میں رکھا ہے۔ غرض کھانا کھا کر پھر آیا۔ آپ پان کھایا اوروں کو کھلایا۔ عطر لگایا اور اسی آن بان اور دل کے اطمینان سے سوار ہو کر چلا۔ قلعے کے دروازے پر اعظم شاہ ایک مختصر خیمے میں بیٹھا تھا اور دم دم کی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ اس کے پاس یہ گئے۔ ملاقات کے وقت گلے سے نایاب موتیوں کی ایک مالا اتار کر شاہزادے کو تحفہ کے طور پر دی۔ بعد اس کے دربار شاہی میں آیا۔ یہاں سوائے ذلت و خواری کے اور کیا توقع تھی۔ چنانچہ قید ہو کر دولت آباد کے قلعے میں گیا اور وہاں سے عالمِ بقا کو پہنچا۔

عالمگیر دکن کے ملکوں کا انتظام کر رہا تھا کہ بڑھاپے کے سبب سے بیمار ہوا۔ جب وقت قریب آیا تو ملک کو تین حصوں میں تقسیم کر کے تینوں بیٹوں کے لئے وصیت نامہ لکھ دیا اور آپ اس ملکِ فنا سے رخصت ہوا۔

عالمگیر کے بلند ارادے اور مستحکم استقلال اکثر موقع پر قابل تعجب تھے۔ چنانچہ اکبر کے عہد سے یہ آئین مقرر تھا کہ بادشاہ ہفتے میں دو دفعہ ہاتھیوں کی لڑائی کا تماشا دیکھا کرتے تھے۔ شاہجہان کے سامنے ایک دفعہ دو مست ہاتھی لڑ رہے تھے۔ خود بادشاہ جھروکوں میں بیٹھے ہوئے تھے اور اکثر شاہزادے و امراء وغیرہ خاص و عام نیچے تماشا دیکھ رہے تھے۔ عالمگیر کی چودہ برس کی عمر تھی اور گھوڑے پر سوار کھڑا تھا۔ اتفاقاً ایک ہاتھی بھاگا اور جدھر یہ کھڑا تھا ادھر ہی آیا۔ سب بھاگ گئے مگر یہ اسی طرح اڑا رہا اور جب ہاتھی حملہ کر کے آیا تو ایک برچھا کان میں مارا کہ سر میں غرق ہو گیا۔ ہاتھی نے چاہا کہ گھوڑے کو سونڈ میں لپیٹ کر دے مارے۔ گھوڑا اس طرح جھکا کہ یہ پشت سے گرا اور پھر اٹھ کر تلوار سونت ایک ہاتھ سونڈ پر مارا۔ اس عرصے میں اور جان نثار آ پہنچے اور ہاتھی بھاگ گیا۔ بادشاہ نے ہزاروں روپے تصدق کئے اور سمجھایا کہ نورِ چشم ایسے موقع پر اس طرح اڑنا نہیں چاہیئے، ہٹ جانا چاہیئے تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ غلام ہٹنے کو پیدا نہیں ہوا۔ اس استقلال نے سخت مزاجی کو پہنچ کر یہاں تک نوبت پہنچائی کہ غیر تو در کنار سگے بھائیوں کا وہ حال کیا۔ باپ کو ایسا قید کیا کہ قیدِ زندگی سے چھوٹ کر اس کی قید سے چھوٹا۔

مشہور ہے کہ عالم قید میں ایک دن باپ نے کہلا بھیجا کہ خالی بیٹھے بیٹھے جی گھبراتا ہے چند لڑکے ہی بھیج دیا کرو کہ انہیں سبق پڑھا کر دل بہلایا کروں۔ عالمگیر نے سن کر کہا کہ اب تک

حکومت سے حضرت کا جی نہیں بھرا ؟

عالمگیر کو ہر قسم کے لہو و لعب سے یہاں تک کہ شعر و سخن سے بھی بالکل رغبت نہ تھی۔ چنانچہ دیوانِ حافظ کا درس مکتبوں سے موقوف کروا دیا تھا مگر باوجود اس کے گلستان اور دیوانِ حافظ ہر وقت سرہانے دھرا رہتا تھا۔ بعض مصاحبوں نے اس کا سبب پوچھا۔ جواب دیا کہ لوگوں کی طبیعتیں خام ہیں، حافظ کے اصل معنی پر خیال نہیں کرتے، ناحق شرابِ گلنار اور معشوقِ گل رخسار کے نام سن کر مست ہو جاتے ہیں۔ اس لئے انہیں اس کا دیکھنا جائز نہیں۔

شاعروں کا بازار اس کے عہد میں سرد ہو گیا تھا مگر دربار میں اکثر امیر بھی موزوں طبع اور عالی دماغ تھے۔ بعض دفعہ ایسے ایسے قصیدے کہہ کر لائے کہ خود بھی محظوظ ہو کر مکرر ان کے اشعار کو پڑھتا رہا مگر جب وہ پڑھ چکے تو ان سے فہمائش میں یہ کہا کہ آئندہ ایسے ... بے فائدہ کام میں اوقات ضائع نہ کرنا۔ باوجود اس کے کبھی کبھی خود بھی شعر کہتا تھا، چنانچہ اسی کا شعر ہے ؎

غمِ عالم فراوان ست و من یک غنچہ دل دارم
چساں در شیشۂ ساعت کنم خاکِ بیاباں را

لطیفہ۔ حالتِ شہزادگی اور عالمِ نوجوانی میں ایک حرم سے محبت تھی وہ قضائے الٰہی سے مر گئی۔ چنانچہ نہایت رنج ہوا اور جی بہلانے کے لئے دوسرے دن شکار کو سوار ہوا۔ جنگل میں جا کر جب خواص خدمت گار اِدھر اُدھر پھیل گئے تو عاقل خاں نام ایک امیر نے چپکے سے عرض کی کہ اس رنج و ملال میں شکار کی تکلیف فرمائی۔ آبدیدہ ہو کر یہ شعر پڑھا ؎

نالہا ے کلبۂ احزاں تسلّی بخش نیست
در بیاباں میتواں فریادِ خاطر خواہ کرد

عاقل خاں نے اپنا شعر پڑھا ؎ عشق چہ آساں نمود آہ چہ دشوار بود
ہجر چہ دشوار بُود یار چہ آساں گرفت

یہ سن کر زار زار آنسو جاری ہو گئے۔ جب دل ٹھیرا تو پوچھا کہ یہ کس کا شعر ہے؟ اس نے عرض کی ایسے شخص کا ہے جو حضور کے سامنے اپنے تئیں شاعر نہیں کہہ سکتا۔ مسکرایا اور کئی دفعہ پڑھوایا۔

قدیم سے قاعدہ تھا کہ جب بادشاہ تخت پر بیٹھتا تھا تو سب شعرائے پائے تخت

اُس کا سکہ کہہ کر لاتے تھے اور جس کا سکہ پسند آتا تھا اُسے ایک لاکھ روپیہ انعام ملتا تھا۔ ان کے لئے بھی لوگ سکے کہہ کر لائے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے بھی اپنا سکہ کہا ہے۔ تم سب دیکھو اور اپنی رائے ظاہر کرو۔ چنانچہ روپیہ کے لئے ہے کہ ؎

سکہ زد در جہاں چو بدر منیر   شاہ اورنگ زیب عالمگیر

اور اشرفی پر ؎ سکہ زد در جہاں چو مہر منیر   شاہ اورنگ زیب عالمگیر

سب نے متفق اللفظ اقرار کیا کہ حقیقت میں اس سے بہتر سکہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ وہی سکہ جاری ہوا۔

سیواجی

کہتے ہیں کہ دکن کے ملکوں میں مالوجی نام ایک سردار تھا۔ خاندان اس کا بھوسلا کہلاتا ہے اور چند خود اسپہ سواروں سے بیجاپور کے دربار کا ملازم تھا۔ انہی ممالک میں لکھ جی جادو راؤ بھی ایک نامی سردار تھا کہ دربار مذکور سے دہ ہزاری منصب رکھتا تھا اور مالوجی کی نسبت ذات میں بالادست شمار ہوتا تھا۔ ایک دن جادو راؤ کے گھر میں کسی تہوار کی تقریب سے بڑا جلسہ ہوا۔ تمام ٹھاکر سردار آکر جمع ہوئے۔ مالوجی بھی اس جلسے میں آیا اور ساتھ اپنے چھوٹے سے بیٹے کو بھی لایا۔ بچے کی پانچ برس کی عمر تھی اور ساہجی نام تھا۔ محفل میں کھیلتا پھرتا تھا۔ اتفاقاً جادو راؤ کی چھوٹی سی بیٹی بھی کھیلتی ہوئی وہیں آگئی۔ چونکہ صحبت بے تکلف تھی، جادو راؤ نے دونوں بچوں کو دونوں زانوؤں پر بٹھا لیا اور باتوں باتوں میں کہنے لگا کہ بچپنے کا زمانہ عجب زمانہ ہے اور اس عمر میں اگر بہارِ زندگی پوچھو تو ان کا بیاہ رچانا ہے۔ مالوجی سنتے ہی بول اٹھا کہ ساری سبھا گواہ رہے میرے فرزند کا رشتہ جادو راؤ جی کی بیٹی سے ہو گیا۔ اگرچہ جادو راؤ کی عالی خاندانی اور بلند نظری اس بات کی برداشت نہ کر سکتی تھی مگر مالوجی کا اقبال بھی اب اوج موج دکھانے لگا تھا اس لئے بدمزہ ہو کر چپکا ہو رہا۔ چند روز کے بعد مالوجی کا ستارہ اور بھی چمکا اور احمد نگر کے دربار سے پنجہزاری کا منصب اور ملک حاصل کیا جس کا راج گدی مقام پونا تھا۔

گو اس سنگائی کا دعویٰ اس نے اب بھی نہ چھوڑا۔ اور فی الحقیقت اب یہ دعویٰ کچھ بیجا بھی نہ تھا۔ چنانچہ جادو راؤ بھی راضی ہو گیا۔ چند روز کے بعد ادھر ساہجی جوان ہو گیا، ادھر لڑکی نے ہوش سنبھالا۔ غرض دونوں کی سنجوگ نے ایسا زور کیا کہ خاندان کی ریت رسوم کے بموجب شادی ہو گئی۔ بڑے بڑے حاکم اور فرماں روا بیاہ میں آئے۔ احمد نگر کا بادشاہ اپنے دربار سمیت براتیوں میں شامل ہوا لیکن عجب شبھ لگن اور مبارک گھڑی سے یہ بیاہ رچا تھا جس کا گُل مراد یہ کھلا کہ چند سال کے بعد سیواجی پیدا ہوئے جن کے قدم سے مرہٹہ کے خاندان میں حکومت کی بنیاد پڑی۔ سیواجی ۳ برس کا تھا جو ساہجی اس کے باپ نے ایک اور شادی کر لی اور بیٹے کو ماں کے پاس بھیج دیا۔ وہاں داداجی نام ایک نامی گرامی پنتھ کا گرو تھا۔ تعلیم و تربیت کے لئے اس کے سپرد کر دیا۔ یہ ہونہار لڑکا وہاں پرورش پاتا رہا اور وہ تربیت پائی جو ایسے ہونہار اولوالعزم کے لئے چاہیئے تھی۔ پڑھنے لکھنے کی طرف توجہ ل نہ کیا مگر تیر اندازی، نیزہ بازی، شمشیر زنی، شہسواری وغیرہ جنگجوؤں کے ہنر سب حاصل کئے۔ جب ہوش سنبھالا تو استاد کی تربیت اور جوہر ذاتی سے ایک جتی ستی پکے عقیدے کا ہندو نکلا۔ اسے اپنی زبان میں ساکھے اور کہانیاں اور نظم کی داستانیں سننے کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ ان کے جوشِ کلام نے دل میں اور بھی خم و نمش پیدا کیا اور یہ شوق ہوا کہ جو مضامین ان کہانیوں میں سوئے ہوئے ہیں انہیں میں میدان جنگ میں للکار کر بیدار کروں۔ جب ۱۶ برس کا ہوا تو جوان بجوان پہاڑی اور جنگلی اہلِ وطن موجود تھے۔ وہیں کے جنگل اور پہاڑوں میں چرندو پرند کے شکار کی مشق کرتے کرتے آدم شکاری اور راہ داری کے میدانوں میں جا پڑا۔ اس اتفاقی تعلیم نے اس ملک کے تمام رستے اور گھاٹیوں کے مقاموں سے آگاہ کیا گویا جنگل اور پہاڑوں کے بن اس کے دل کی امنگ کے لئے پرورش کا پنگوڑا ہو گئے۔ جب ۱۹ برس کا ہوا تو لوٹ مار کرتے کرتے ایک قلعہ مار لیا۔ دو برس کے بعد ایسا ہو گیا کہ خود ایک جنگی قلعہ بنا کر برج و خندق سے خاطرخواہ مستحکم کیا۔

بیجاپور کا بادشاہ یہ خبر سن کر صبر نہ کر سکا اور داداجی ان کے استاد گرو سے جواب طلب کیا۔ اگرچہ داداجی اپنے نونہال کو پھلتا دیکھ کر دل میں تو پھولا نہ سماتا تھا مگر ظاہر میں صاف انکار کر گیا اور لکھا کہ لڑکے نے جو کچھ کیا اپنی شوخ مزاجی سے کیا ہوگا۔ مجھے اس معاملے سے مطلق علاقہ نہیں۔ چند روز کے بعد داداجی بیمار ہوا۔ جب حال اپنا غیر دیکھا تو سیواجی کو

بسترِ مرگ پر بلا کر پاس بٹھایا اور کہا کہ اے فرزند ہمیں قضائے آسمانی سے وہ سفر پیش آیا ہے جس سے کسی فردِ بشر کو چارہ نہیں اور رستہ اس کا ایسا ہے جہاں سے پھرنے کا گزارا نہیں۔ مجھے اس دریائے بے بقا میں پار اُترنا ہے اور بڑی بڑی مہموں کا سر کرنا ہے۔ مگر دیکھتا ہوں کہ اکیلا ہے اور دنیا کا ابھی کچھ دیکھا نہیں ہے اس لئے چند نصیحتیں کرتا ہوں اور خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ سب سے اوّل یہ کہ دھرم گیان پر قائم رہنا اور گائے برہمن کا ادب رکھنا۔ پھر خاندان کی حمایت کو لازم سمجھنا۔ سپاہی کو جان سے پیارا سمجھ کر اس کی دلداری اور پرورش میں ساعی رہنا۔ ٹھاکر اور ٹھاکر دوارے کی حفاظت فرضِ عین سمجھنا اور جس میدان میں قدم مارا ہے پیچھے نہ ہٹانا آگے جو کرے سو خدا۔ دادا جی نے تو یہ کہہ کر قضا کی۔ سیواجی نے فرزندی دعویٰ سے اس کی جاگیر اور مال و متاع پر قبضہ کیا۔ لیکن جو روپیہ خزانے اور علاقے سے ہاتھ آیا اسے تمام فوج پر تقسیم کر دیا اور ملک گیری کے میدان میں دل کھول کر گھوڑے دوڑانے شروع کر دیئے۔ پہلا شکار تو یہی مارا کہ کوئی بادشاہی سردار تین لاکھ اشرفی کا خزانہ بیجاپور کو لئے جاتا تھا اس پر جا گرا اور سارا خزانہ لے کر پہاڑوں میں گھس گیا۔ چند روز کے بعد ایک انبوہِ کثیر ساتھ لے کر نکلا جس کے نقاروں سے گیان دھرم کی گونج اٹھی اس حکمت سے تمام گرد و پیش کے علاقوں میں ایک طوفان مچ گیا۔ چنانچہ اکثر قلعے فتح کئے اور قلعہ دار اُن کے گرفتار کر لئے۔ مگر جب انہیں سامنے بلایا تو بہت عزت سے پیش آیا اور انعام و اکرام دے کر رخصت کیا۔

سیواجی کی طبیعت جس طرح گیان دھرم کی طرف راغب تھی، اسی طرح مسلمانوں کے رسم و رواج سے متنفر تھی اور اس سے زیادہ حمایتِ قومی کے حق میں سرگرم تھی۔ چنانچہ یہ سب باتیں اس وقت کی چالوں کے لئے ایسی موافق پڑیں کہ خاص و عام ہنود کے دلوں میں شوق کے ولولے جوش مارنے لگے اور ترقی کے دریا لہرانے لگے اور جب مضامین جمع ہو گئے تو شاعری آسان ہو گئی۔ چنانچہ اس نے بھی جتنی بنتی ہو کہ بھگتوں کی صورت بنالی اور اس قسم کے اشارے کرنے لگا جس سے معلوم ہو کہ اس کے حال پر اوتاروں اور دیوی دیوتاؤں کی طرف سے ضرور دیا کی نگاہ ہے۔

بیجاپور کا بادشاہ یہ ہتھکنڈے دیکھ کر آگ بگولا ہو گیا۔ ساہجی یعنی سیواجی کا باپ بادشاہ مذکور کی طرف سے کرناٹک کا صوبہ تھا۔ اس سے بدعملی کا جواب طلب ہوا۔ مگر

باباجی نے وہی معمولی جواب دیا جو داداجی نے دیا تھا۔ چنانچہ بادشاہ نے کسی بہانے سے اُسے دربار میں بلا کر قید کر لیا اور کہا کہ اگر تمہارا بیٹا اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے گا تو قید خانے کا دروازہ تیغہ کر دیا جائے گا کہ پھر جیتے جی نکلنا نصیب نہ ہوگا۔ سیواجی اس وقت بائیس برس کا نوجوان تھا یہ خبر سن کر رنج تو بہت ہوا۔ مگر ذرا نہ گھبرایا بلکہ تدبیر کے رستے پر متوجہ ہوا اور سوچا کہ اس کڑے وقت میں بادشاہِ دہلی کی طرف رجوع کرنی چاہیئے۔ چنانچہ یہ منصوبہ اس کا نہایت ٹھیک پڑا اور انتہائے مطلب یہ ہے کہ شاہجہان کے دربار سے پنجہزاری کا منصب حاصل کر لیا۔ اس عرصے میں ساہجی کے بوڑھے نصیبے نے بھی آنکھ کھولی یعنی اس کے علاقے پر کوئی غنیم آکر گرا۔ اس وقت دربارِ بیجاپور میں صلاح ہوئی کہ ساہجی کو رہا کر کے اس کے علاقے پر بھیجدینا چاہیئے۔ چنانچہ اسے طوق و زنجیر سے نکال بحالی کا خلعت پہنا دیا اور وہ کہن سال بوڑھا موچھوں پر تاؤ دیتا پھر اپنی حکومت پر آقائم ہوا۔ سیواجی کا زور اور اطمینان دوبالا ہوگیا۔ چنانچہ پونا کے راجہ کو جا مارا۔ کئی قلعے تسخیر کئے کئی قلعے خود تعمیر کئے اورنگ زیب شاہزادگی کے عالم میں دکن کی طرف ملک گیری کر رہا تھا۔ اس سے مل کر سندِ شاہی کو تازہ کیا اور اپنے ملکِ مقبوضہ کے زور کو زیادہ زر پختہ کر کے خدمت گزاری کے ساتھ ہوگیا۔ لیکن تھوڑے دنوں کے بعد جو ایک موقع ہاتھ آیا تو اس کے علاقے میں بھی کئی جگہ ہاتھ مارا اور پھر ایسا صاف اڑ گیا کہ اورنگ زیب بھی دیکھتا رہ گیا۔ چند روز کے بعد شاہجہان کی بیماری کے سبب سے شاہزادے کو ہندوستان کی طرف پھرنا پڑا۔ اس نے پھر موقع پایا اور وکیل بھیجا کہ میری پہلی خدمتوں پر لحاظ ہو اور قصور معاف ہو۔ چونکہ وقت نازک تھا اس لئے شاہزادے نے فرمانِ معافی بھیج کر لکھا کہ قصور معاف، ملک برقرار۔ لیکن اپنی فوج ہمارے ہمراہ رکاب کر دو۔ جب تک شاہزادہ ادھر رہا سیواجی زبانی باتوں میں ٹالتے رہے۔ مگر فوج کے بھیجنے کو صاف اڑا گئے۔ جب اورنگ زیب ادھر آیا اور ہندوستان اور پنجاب کی مہموں میں لگ گیا تو دکن کا میدان خالی ہوا۔ انہوں نے پھر بادشاہ بیجاپور کو دق کرنا شروع کیا۔ چنانچہ وہاں سے افضل خاں نام ایک سردار بادشاہی دھوم دھام سے جلو میں لے کر روانہ ہوا اور حکم ہوا کہ سیواجی کا خاطر خواہ علاج کر کے پھرے۔

افضل خاں پرانا سپہ سالار بڑی آن بان سے اپنے نمود کے زور میں پھر اچلاتا آتا تھا

اس نوجوان کو جب خبر پہنچی تو اپنی کمزور حالت کو اور بھی خوف زدہ بنا کر اپنے قلعہ میں ہو بیٹھا اور عذر معذرت کے خطوط بھیجنے شروع کر دیئے۔ خان ایک تو پہلے ہی ہوا میں بھرے ہوئے تھے اب اور بھی پھولے، مگر سیوا جی نے بڑا پیچ یہ کھیلا کہ افضل خان کا دیوان ایک برہمن تھا اسے ملا لیا۔ اُس نے خان مذکور کو بالکل منقوش خاطر کر دیا کہ نوجوان میں اصلاً تاب مقابلہ کی نہیں۔ ایک قلعے میں پناہ پکڑ کر بیٹھ گیا ہے اور اپنے حال میں سخت پریشان ہے کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ افضل خاں شیر ہو کر اور آگے چلا اور انہی پیغام سلاموں میں بہت سے بن اور کوہستان دشوار گزار طے کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔
جب قلعے کے نیچے دامنِ کوہ میں پہنچے تو سیوا جی نے وکیل بھیجا اور کہا کہ آپ بزرگ ہیں، آپ کو میرے حال پر شفقت اور مرحمت کرنی چاہیئے۔ اگر آپ کی بدولت دربار سے میری عزت میں فرق نہ آئے تو مجھے اطاعت اور جان نثاری میں کچھ عذر نہیں۔ مگر چند باتیں زبانی کہنی ہیں۔ آپ اُدھر سے خود تشریف لایئے ادھر سے میں حاضر ہوتا ہوں، بالمواجہ ان کا فیصلہ ہو جائے۔
خان مذکور چند سپاہیوں کو ساتھ لے کر دامنِ کوہ سے قلعے کی طرف بڑھا تھا جو دیوان مذکور کی معرفت پھر عرض ہوئی کہ مجھ بے مقدار کو اس جمعیت سے بھی اندیشہ آتا ہے۔ میں حاضر ہوتا ہوں میرے ساتھ بھی ایک خدمتگار سے زیادہ نہیں۔ آپ بھی اپنی جمعیت کو وہیں چھوڑ دیں۔ خان بہادر نے اپنی جسانی کے گھمنڈ میں انہیں بھی وہیں چھوڑا۔ فقط ایک خدمتگار ساتھ لئے۔ گلے میں تن زیب کا جامہ، ہاتھ میں ایک سیدھی سیف کہ وہ بھی کسی اور ارادے سے نہ تھی۔ فقط نمائش اور زیبائش کی غرض سے لی تھی۔ خراماں خراماں قلعہ کی طرف چلے۔ ادھر سے سیوا جی ایک روئی دار دوگلہ پہنے اس کے نیچے فولادی زرہ، بغل میں تلوار دبائے، سکڑے سمٹے نوناد ہوئے مگر اس طرح کہ گویا ڈرے جاتے ہیں اور خان کے رعب کے مارے چل بھی نہیں سکتے۔ خان بہادر نے اس کی سوکھی سہمی صورت کو تیوری بدل کر ترچھی نگاہ سے دیکھا اور بڑے فخر کے ساتھ گلے ملنے کو ہاتھ بڑھائے۔ سیوا جی نے دونوں ہاتھوں پر فولادی بگ نونہ[1] چڑھائے ہوئے تھے، گلے ملتے ہی اس طرح چبھوئے کہ اس کی پیٹھ کے پار ہو گئے۔ خان بے چارہ ابھی حیران ہی تھا کہ یہ بلا کیا ہوئی؟ جو اس نے ایک بچھوے سے اس کا کام تمام کر دیا۔ اگرچہ افضل خاں نے بھی ایک ہاتھ مارا مگر

---

[1] دکن کے سپاہی فولادی پنجے ہاتھوں پر چڑھا لیتے تھے جس سے مخالفوں کو نوچتے تھے اور انہیں بگ نونہ کہتے تھے یعنی پنجہ شیر۔

سیواجی کے خود نے بچالیا۔ سیواجی نے کمال یہ کیا تھا کہ جنگل کی جھاڑیوں میں جابجا اپنے سوار لگا رکھے تھے۔ چنانچہ اسی وقت انہیں ہرکارے دوڑا دیے۔ خان کا لشکر جہاں تہاں بے فکر اور بے خبر پڑا تھا یہ چاروں طرف سے گھر کر اس طرح اس پر گر پڑے کہ سب تتر بتر ہو گئے اور بے شمار لوٹ ہاتھ آئی۔ چند روز کے بعد سب ادھر سے پیٹ بھر کر خاطر جمع کر لی تو عالمگیر کو دق کرنا شروع کیا

عالمگیر اب بالاستقلال بادشاہ ہو گیا تھا اور سیواجی اس عرصے میں کھلا میدان پاکر چاروں طرف دوڑتا پھرتا تھا۔ چنانچہ اس کے بندوبست کے لئے عالمگیر نے شائستہ خاں حاکم اورنگ آباد کے نام فرمان جاری کیا۔ شائستہ خاں نے اس کی دست درازیوں کی روک تھام شروع کی اور فوج لے کر مارتا پیٹتا آگے بڑھا۔ اچھے اچھے میدان ہوئے۔ اور مرہٹے ان میں ایسے ایسے اڑے کہ مر کے ہٹے۔ آخر شائستہ خاں نے بڑھتے بڑھتے خاص پونا میں جا کر مقام کیا اور اتفاق یہ کہ اسی محل میں سکونت اختیار کی جہاں سیواجی نے بچپنے میں پرورش پائی تھی۔ الغرض یہاں بیٹھ کر ادھر ادھر فوج پھیلا دی اور اس طرح کا کڑا بندوبست کیا کہ اکیلا دکیلا آدمی بھی بے خبر نہ نکلنے پاتا تھا۔ لشکر شہر کے گرد پڑا تھا اور آپ خاطر جمع سے محلوں میں بیٹھا تھا۔ چونکہ پونا کی سرزمین وہی میدان تھے جہاں سیواجی شیر نے بچپن میں کود پھاند کر ملک گیری کی مشق کی تھی۔ اس لئے وہاں کے گھر گھر بلکہ اس کی چپے چپے زمین سے خوب واقف تھا اور آپ باوجودیکہ شاہی فوج ہر طرف پھیلی تھی مگر اس پاس داؤں گھات میں لگا ہوا تھا۔ چنانچہ سوچ سوچ کر یہ رستہ نکالا کہ شائستہ خاں کی فوج میں ایک سپاہی نوکر تھا اس سے سازش کی اور وہ اس کی صلاح سے ایک برات بنا کر شہر کو لے چلا۔ اس نے سو سو پچاس پچاس پیادے کچھ کچھ فاصلے سے راہ میں چھوڑے اور آپ پچیس جانبازوں کے ساتھ براتیوں میں مل گیا۔ سرِ شام برات شہر کے قریب پہنچی اور بے تکلف لشکر کے بیچ سے گزر شہر میں داخل ہوئی۔ شیر دلیر نے محل کے نیچے کھڑے ہو کر دم لیا اور چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ دیکھا کہ سب اپنے اپنے کاروبار میں بے خبر ہیں۔ یہ پچھواڑے کے دروازے سے اندر داخل ہو کر دفعتہً بادل کی طرح گرجا اور ایسا بلائے ناگہانی کی طرح پہنچا کہ شائستہ خاں حیران رہ گیا۔ ایسے وقت میں جان بچا کر نکل جانا فتحِ عظیم سمجھا۔ چنانچہ گھبرا کر ایک کھڑکی سے کود کر بھاگا بلکہ اپنے ہاتھ کی دو انگلیاں بھی وہیں چھوڑ گیا۔

شائستہ خاں تو ناشائستگی کا داغ پیشانی پر لے کر بھاگا مگر اس کا بیٹا اور بہت سے رفیق مارے گئے اور سیوا جی اپنا کام کر کے جس طرح آیا تھا اسی طرح پاک صاف نکل گیا۔ راہ میں جہاں جہاں سپاہی چھوڑ آیا تھا وہ بیٹھے اس کی سیوا کر رہے تھے چنانچہ انہیں لیتا اور نقارے پر فتح کا ڈنکا دیتا اپنے مورچوں میں جا پہنچا۔ اس کامیابی کی اس کے لشکر میں بڑی بڑی خوشیاں ہوئیں اور ایسی روشنی کی کہ ۱۲ میل کے فاصلے پر بادشاہی لوگ پڑے تھے مگر تمام چراغاں دکھائی دیتے تھے۔ حقیقت میں کل قوم کے لئے یہ معرکہ باعث فخر اور سرمایۂ عزت ہوا۔ چنانچہ اب تک بھی مرہٹے اس کارنامے کو بڑی دھوم دھام سے فخریہ بیان کرتے ہیں۔ مرہٹے کا فرقہ طبیعت کا محنت کش بدن کا ایسا چالاک اور پھرتیلا تھا کہ دکن کی سرکاروں میں پلٹنوں اور سواروں میں بھرتی ہو کر دھاووں اور یلغاروں میں خوب کام دیتے تھے۔ چنانچہ سیوا جی نے اپنی قوم کے آدمیوں کو اس کام کا اوزار دیکھ کر ان سے کام لینا چاہا۔ سب کو سمیٹ کر لشکر میں بھرتی کر لیا اور اپنے نمک کے زور سے قومی سہادت کو دلوں میں اور بھی اشتعال دی۔ چنانچہ اب قدم ہمت کو آگے بڑھایا اور بڑھتے بڑھتے یہاں تک ہوا کہ سورت جیسے مالا مال شہر اور پر زور بندر کو جا مارا اور چونکہ مقام مذکور کھلا میدان اور بے آڑ جگہ تھی، اس لئے خوب جی کھول کر لوٹا اور دولت اور مال بے قیاس باندھ باندھ کر اپنے ٹھکانے لے گیا۔

چند روز کے بعد ساہو جی کی سنانی آئی۔ اب سیوا جی اور بھی کھل کھیلے۔ چنانچہ نام پر راجگی کا طرہ اور روپیہ اشرفی پر سکہ لگایا اور سلطنت کی صورت بنا کر راج قائم کر دیا۔ ادھر بیجاپور سے لڑائی شروع کر دی۔ ادھر ایک بیڑا کشتیوں کا بنوا کر دریا میں دوڑایا اور لوٹ مار سے تر و خشک کو یکساں کر دیا۔ مگر مشکل یہ ہوئی کہ ان میں چند کشتیاں وہ بھی لوٹ لیں جن پر حاجی لوگ ممالکِ ہندوستان سے جاتے تھے اور بادشاہ دہلی کی رعایا تھے۔ اورنگ زیب کو انتقام لینے کے لئے اس سے بہتر موقع نہ ہاتھ آیا اور اس قدر غصہ ہوا کہ گویا آپے سے باہر ہو گیا۔ فوراً جہاد کا فتویٰ لگایا اور لشکرِ جرار روانہ کیا۔ فوج شاہی جاتے ہی چاروں طرف پھیل گئی اور جا بجا اس کے قلعوں پر محاصرے ڈال دیئے۔ سیوا جی جب سب طرف سے تنگ ہوا تو دیکھا کہ اورنگ زیب کو دکن کے قلعوں کی تسخیر کا بڑا شوق ہے مصلحت یہ ہے کہ اس وقت اس سے مل کر بیجاپور پر چلئے اور فوج کو لوٹ کی چاٹ دیجئے۔ جب

بادشاہی فوج کا ٹڈی دل دلی چلا جائے گا پھر جیسا ہوگا دیکھا جائے گا۔

راجہ جے سنگھ۔ عالمگیر کا سپہ سالار تھا اس سے خط و کتابت جاری کی اور چند ہمراہیوں کے ساتھ بے تکلف آن موجود ہوا۔ سپہ سالار مذکور بڑی خاطر داری سے پیش آیا اور اس نے بھی بڑی عاجزی سے جاں نثاری اور وفاداری کے قول قرار کئے۔ راجہ کی سفارش سے اکثر درخواستیں اس کی دربار شاہی میں منظور ہوئیں اور عزت و توقیر کی سرخی سے فرمانوں کی پیشانی نے رونق پائی۔ چنانچہ سیواجی اپنی فوج کو لے کر راجہ جے سنگھ کے ساتھ لشکر میں شامل ہوگیا اور فوج شاہی نے بیجاپور پر علم اٹھائے ان میدانوں میں مرہٹوں نے ایسی ایسی جانبازیاں دکھائیں کہ اورنگ زیب بھی قائل ہوگیا۔ چنانچہ راجہ نے خود اپنے خطوط میں لکھ کر فرزندوں اور نمک خواروں کو اُن کی جراتیں جتائیں۔ سیواجی کو راجہ کی رفاقت اور بادشاہ کی عنایت نے بڑا دھوکا دیا یعنی علاقے پر اپنے معتبر کو چھوڑا اور آپ سنبھاجی بیٹے کو مع پانسو سوار اور سو پیادے مرہٹے کے ساتھ لے کر دلی کو چلا۔ مگر افسوس کہ دلی کے تخت پر اُس وقت نہ اکبر تھا نہ شاہجہان جو اس اولوالعزم بہادر کو دل و جان سے بندۂ احسان بنالیتا یہاں اورنگ زیب تھا اور سیواجی کی ساری اگلی پچھلی باتوں کو دل کے اندر امانت لئے بیٹھا تھا۔ کھلم کھلا سزا دینی تو مناسب نہ سمجھی۔ یہ چاہا کہ اس کی کم ذاتی کا داغ اور بے حقیقی کا رنگ لوگوں کو دکھا کر بے عزت کرے اور جو جو حرکتیں اس نے کی ہیں ان کا بخار نکالے۔ چنانچہ جب سیواجی دلی کے پاس پہنچے تو راجہ جے سنگھ کے بیٹے کے ساتھ ایک بے حقیقت سے آدمی کو لینے کے لئے بھیجا۔ سیواجی کو یہ امر ناگوار تو گزرا مگر پھر بھی دربار میں آیا اور نذرانہ گراں بہا پیش کر کے بڑے حوصلے کے ساتھ دعا و ثنا کے فقرے ادا کرتا ہوا آگے بڑھا کہ بادشاہ نظر عنایت سے دیکھیں۔ شاہ عالی دماغ نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور چوب دار نے اسے تیسرے درجے کے امیروں میں لے جا کر کھڑا کر دیا۔ سیواجی کو اس بات کا ایسا رنج ہوا کہ چہرے کا رنگ بدل گیا اور صف سے کچھ پیچھے کو ہٹا اس پر بھی دل کو تاب نہ آئی اور غش کھا کر گر پڑا۔ جب ہوش میں آیا تو جے سنگھ کے بیٹے کو سرہانے کھڑا پایا۔ جے سنگھ کو بہت برا بھلا کہا کہ اس کی بدولت یہ ذلت و خواری مجھے نصیب ہوئی خیر جب بادشاہ نے میری آبرو کو خاک میں ملایا تو جان کس کے لئے چھوڑ لی ہے اس کا بھی فیصلہ کر دے۔ غرض ایسی جلی بھنی باتیں کر کے دربار سے بے رخصت اپنی فرودگاہ کو چلا گیا۔ اورنگ زیب ایسی باتیں

خدمت بجا لاتا تھا۔ اس حرکت کو ایسا ٹال گیا گویا گستاخی سمجھا ہی نہیں۔ کہا تو یہ کہا کہ جے سنگھ نے جو اس سے وعدے وعید کئے ہیں ہمیں معلوم نہیں ان سے دریافت کیا جائے گا۔ مگر اس کی فرزدگا، پر پہرے بیٹھ جائیں۔

سیواجی سمجھے قید تو ہو لئے مگر اس پھندے سے کسی طرح نکلنا چاہیئے۔ چنانچہ اس کا رستہ یہ نکالا کہ پہلے اپنے ساتھیوں کو بیمار ڈالا اور ہوا کی ناموافقت کا بہانہ کر کے ان کے وطن جانے کی اجازت مانگی۔ بھانا بادشاہ چوکا اور اس کی جمعیت گھٹنی غنیمت سمجھ کر خوشی خوشی منظور کر لیا۔ وہ لوگ یہاں سے نکلے مگر کچھ تو بھیس بدل کر شہر ہی میں رہ گئے اور کچھ منزل بمنزل وطن تک پھیل کر بیٹھ گئے۔ بعد اس کے خود سیواجی بھی بستر بیماری پر پڑ گیا۔ عالمگیر نے بید حکیم بھیجے۔ ان کا علاج شروع ہوا۔ روز نسخے لکھے جاتے اور دوائیں تیار ہوتیں۔ مگر یہ عالمگیر کا بھی استاد تھا اس نے روپیہ کی چاٹ پر لگا کر حکیموں کو گانٹھ لیا اور مٹھائی وغیرہ کھانے پینے کی چیزیں غریب فقیروں کو بانٹنے کے لئے منگانی شروع کیں۔ اشیائے مذکور بڑے بڑے ٹوکروں میں رکھ کر اور کسنوں میں کس کر آنے لگیں۔ چنانچہ اول اول پہرہ داروں نے روکا جب دیکھا کہ اس میں کھانے کے سوا کچھ نہیں تو انہوں نے بھی روک ٹوک موقوف کر دی۔ سیواجی ایک دن سر شام سے منہ لپیٹ کر لیٹ رہا جب کچھ رات گئی تو ایک نوکر کو اپنی جگہ سلا دیا اور ایک ٹوکرے میں آپ بیٹھ کر دوسرے میں بیٹے کو بٹھایا۔ رازدار نمک حلال موجود تھے، بے تکلف سر پہ دھر پہرے داروں کے سامنے سے لئے چلے گئے۔ کسی کو خبر نہ ہوئی۔ باہر جان نثار منتظر بیٹھے تھے اور گھوڑا تیار تھا اسی وقت سوار ہوا اس طرح نکل گیا گویا یہاں تھا ہی نہیں۔ ادھر کچھ دیر کے بعد پہرے داروں کو کھٹکا گزرا دیکھا تو بستر پر نوکر پڑا پایا۔ داروغہ بے چارہ بہت گھبرایا۔ اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ اتنے میں بادشاہ کو خبر ہو اور حکم احکام جاری ہوں، اتنے میں وہ ایک بے خطر رستے لے کر متھرا کو سیدھا ہوا اور پل کے پل میں کہیں کا کہیں نکل گیا۔

متھرا میں سیواجی کے سیوک دن رات بیٹھے ان کی سیوا کر رہے تھے چنانچہ وہاں پہنچ کر داڑھی موچھ کو صفائی بتائی، سادھوؤں کی صورت بنائی، بدن پر بھبوت رمائی اور ایسے رستے سے دکن کو نکل گئے جہاں سے کسی کے وہم و گمان کا بھی گزر نہ ہو۔ بیٹے کو ایک برہمن کے سپرد کر گئے کہ خاطر جمع سے ہمارے پاس پہنچا دینا۔ دکن میں پہنچتے ہی سیواجی

دہی تھے اور ان کے ہتھ کنڈے وہی تھے۔ وہاں جاکر خوب دل کا بخار نکالا اور تمام اضلاع کو زیر وزبر کرکے قیامت برپا کردی۔

ادھر جب عالمگیر کو خبر ہوئی تو بہت پیچ وتاب کھایا اور ولی عہد سلطنت کو مع دو اور جنگ آزمودہ سرداروں کی فوجیں دے کر بڑی دھوم دھام سے روانہ کیا۔ ادھر سیواجی بھی ایک آفت تھے۔ انہوں نے ولی عہد اور سرداران مذکور سے سازش کرنی شروع کردی۔ ادھر عالمگیر بھی قیامت تھے۔ انہوں نے پہلے ہی پٹی پڑھادی تھی کہ سپاہیانہ پیچوں میں کسی طرح دریغ نہ کرنا۔ بیشک مل جانا مگر جس وقت موقع پر چڑھے تو خواہ قید خواہ قتل کسی بات میں نہ چوکنا۔ چنانچہ چند روز لڑائیاں بھی ہوتی رہیں اور اس طرح کے وار بھی چلتے رہے۔ آخر سیواجی کا وار پورا پڑا کہ عالمگیر اپنے بیٹوں اور سرداروں کی جانب سے بدگمان ہوگیا اور انہیں بلاکر اور سرداروں کو بھیج دیا۔ مگر سیواجی کی خوش نصیبی یہ کہ بادشاہ خود پنجاب کی سرحد پر افغانوں کو دبا رہا تھا۔ چنانچہ وہ تو کئی برس تک اِدھر اُدھر مصروف رہا۔ دکن کا فساد ادھر خاطر جمع سے پرورش پاتا رہا اور جو سپہ سالار وہاں تھا اس کا یہ حال ہوگیا کہ خود حملہ کرنا تو بالائے طاق غنیم کا روکنا بھی اسے مشکل ہوگیا۔

سیواجی اب اپنے جی کے راجہ ہوگئے جب چاہتے اٹھتے اور کوئی نہ کوئی قلعہ مار لیتے اسی عرصے میں ان کی سال گرہ کا دن آیا۔ انہوں نے راج تلک کا جشن کیا اور تمام راج گانہ رسمیں برت کر وہ زرق وبرق دکھائی کہ بکرماجیت اور راجہ بھوج کے دربار گرد ہوگئے۔ تُل بیٹھ کر سونے کا تلادان کیا۔ سونا روپا جواہرات نچھاور کئے۔ سرداروں کو خلعت منصب اور بڑے بڑے انعام اور جاگیریں عطا کیں۔ فارسی خطابوں کی جگہ سنسکرت لفظوں کے خطاب دیئے اور وہ حکمتیں برتیں جس سے مذہبی جوش اور قومی خروش مل کر ایک عجیب ہیولا کھڑا ہوگیا۔

سیواجی اس عرصے میں اپنے ملک کو پھیلاتا اور ملکی زور کو بڑھاتا رہا۔ چند روز کے بعد عالمگیر بادشاہ نے فوج کثیر کے ساتھ ایک سپہ سالار کو گولکنڈہ پر چڑھایا اور پیچھے اس کے ولی عہد کو بھیجا کہ بیجاپور کا محاصرہ کرے۔ بیجاپور کا مسند نشین تو خورد سال تھا اس کے وزیر نے گھبرا کر سیواجی سے مدد مانگی۔ اس نے غنیمت سمجھ کر اسی وقت سواری کا حکم دیا۔ ہزاروں برچھیت مرہٹا بھالے اور برچھے سنبھال سنبھال کر اٹھ کھڑے ہوئے اور یہ اس ریگستان رواں کو لیکر

روانہ ہوا مگر پورا سپاہی تھا۔ اپنے بازوؤں میں عالمگیری لشکر کے مقابلے کی طاقت نہ دیکھی۔ اس لئے لشکر سے بچ کر علاقوں پر آن گرا۔ اور جہاں گزر ہوا تمام ملک کو ستیاناس کر دیا۔ عالمگیر بھی انتظام میں یکتا اور بندوبست کا پکا تھا۔ چاروں طرف احکام جاری کئے اور ہیر پھیر کر ایسی جگہ لا ڈالا جہاں سیواجی چاروں طرف سے گھر گئے۔ ادھر یہ بھی بقول عالمگیر کے پہاڑی چوہا تھا۔ اس طرح دبک کر نکل گیا کہ اہل لشکر دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ عالمگیر تو اپنے کارگزاروں پر غصہ اور عتاب کے فرمان جاری کرتے رہے پر چند ہی روز کے بعد نکلے اور ایسی کڑک دبک سے نکلے کہ پہلے سے دہ چند زیادہ۔ اس عرصے میں عالمگیری فوج نے بیجاپور کو نہایت تنگ کر رکھا تھا۔ چنانچہ اب کی دفعہ وزیر بیجاپور نے سیواجی کو بڑی منت سماجت سے مراسلہ لکھا اور اخیر میں یہ بھی لکھا کہ زیادہ تحریر کی گنجائش نہیں لیکن آنا ہے تو اس وقت سے پہلے کام آؤ کہ بعد اس کے آنا بے کار ہو۔ بہادر کو پھر سپاہگری کا جوش آ گیا اسی وقت لشکر جرار پیادہ اور سوار کا لے کر دکھنی گھوڑی کی باگ اٹھائی۔ یلغار کرتا جاتا تھا جو رستے میں پرچہ لگا کہ سنبھاجی یعنی راج کنور آپ کا سپہ سالار عالمگیر سے جا ملا۔ سیواجی سنتے ہی گھبرا گیا مگر پھر بھی ہوش و حواس کو قائم رکھ کر فوج کشی کے کاروبار بدستور جاری رکھے۔ ادھر سنبھاجی جب سپہ سالار کے پاس آیا تو بڑی آؤ بھگت سے اس کا استقبال ہوا اور خیمہ گاہ میں پہنچا تو سپہ سالار سرو قد کھڑا ہو گیا۔ نہایت تپاک سے ہاتھ کھول کر بغلگیر ہوا اور اعزاز و احترام سے خیموں اور سراپردوں میں اتارا۔ سپہ سالار مذکور نے تدبیر یہ سوچی تھی کہ جب بیٹے کو فوج و حشم اور طبل و علم سے ساتھ لے کر آگے بڑھائیں گے تو باپ کی جمعیت خاندانی میں تفرقہ پڑ جائے گا مگر سیواجی کا ستارہ اوج پر تھا۔ اول تو لڑکے نے باپ کے اطوار و خصائل میں سے خودسری اور سرشوری کے سوا کچھ نہ لیا تھا۔ دوسرے یہ پیچ پڑا کہ سپہ سالار مذکور نے جو عالمگیر کو یہ سارا عرض حال لکھا تو وہاں سے حکم آیا کہ اسے فوراً قید کر لو اور پابزنجیر کر کے ہمارے پاس بھیجدو۔ سپہ سالار نے ایسی اطاعت کو عہد مروت کے برخلاف دیکھ کر اسے چھوڑ دیا۔ اور وہ چھوٹتے ہی سیدھا باپ کے پاس پہنچا۔ اب سیواجی نے لشکر شاہی کو دن رات دھاوے کر کے اور جابجا رسدوں پر چھاپے مار کے ایسا تنگ کیا کہ سپہ سالار مذکور کو بیجاپور سے محاصرہ اٹھا لینے کے سوا کچھ نہ بن آیا۔ یہ مدد جو عین فتحیابی کا تاج تھی اس کے صلہ میں دربار بیجاپور سے سیواجی

کے بڑے شکر گزار ہوتے بلکہ مبارک باد کے خلعت اور تحفوں کے ساتھ باپ کے سارے حقوق عنایت ہوئے۔ اب شان و شوکت کے سامان اور زور شور کے نشان ایک سے ہزار ہو گئے اور وہ وقت آ گیا کہ جو جو آرزوئیں دل کی ہیں انہیں جی کھول کر پورا کرے، یعنی اپنے حریفوں سے سینہ بسینہ مقابلے کر کے ملک کو خاطر خواہ پھیلائے۔ یہ ان فکروں میں تھا جو دفعتہً پیامِ اجل آیا اور ایسی یکایک طبیعت بگڑی کہ ۳۲ برس کی عمر میں سارے ارمان سینے میں لئے ہوئے دُنیا سے چلا گیا۔

محمد شاہ کی تمہیدِ سلطنت

بہادر شاہ یعنی عالمگیر کے بیٹے نے باپ کے بعد سوا پانچ برس بادشاہت کی۔ مگر اس کے بعد امیروں کے کئی جتھے ہو گئے، اور تخت کے وارثوں میں ایسی تلوار چلی کہ برس دن میں کئی دعویدار شاہزادے مارے گئے۔ آخر فرخ سیر تخت پر بیٹھا، مگر وہ عیش و عشرت میں ایسا مست و مدہوش ہوا کہ تاجِ شاہی کو سر پر سنبھال نہ سکا بلکہ وزیر اور سپہ سالار کو جو اس کے باعثِ تقویت ہوئے تھے انہی کے مارنے کے درپے ہوا۔ چنانچہ مستی کا وار تو پورا نہ پڑا، ہشیاری اپنا کام کر گئی۔ انہوں نے چھ مہینے میں سپے درپے دو اور شاہزادے بھولے بھالے ڈھونڈ کر تخت پر بٹھائے۔ شہزادے تو بہت سے نظر بند پڑے تھے۔ مگر انہیں ایسا عقل کا پورا چاہیے تھا جو کٹ پتلی کی طرح ان کے اشارے پر چلے۔ آخر ایک شہزادہ بہادر شاہ کا پوتا سلیم گڑھ میں قید تھا، اس کے نام پر مصلحت کا قرعہ پڑا۔ دربار اور اہلِ دربار اس وقت آگرے میں تھے، چنانچہ امرا اس کے لینے کو روانہ ہوئے۔

محمد شاہ کا زمانہ اور نادر شاہ کا آنا

روشن اختر شاہزادہ اگرچہ قید خانے میں تھا لیکن دنیا کی آفتوں سے محفوظ ماں کے پہلو میں بےفکر بیٹھا تھا۔ دفعتہً ستارۂ اقبال اوج پر آیا۔ چند امیروں نے آکر مجرا کیا اور دست بستہ عرض کی کہ تخت حاضر ہے، چل کر اپنے قدم سے رونق دیجئے۔ شاہزادہ تو لڑکا تھا اور برسوں سے قید خانے میں آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ مگر ماں دیکھ رہی تھی کہ جو بادشاہ ہوتا ہے وہی تخت کی قربانی ہوتا ہے، اس لئے ہاتھ جوڑتی پردے سے نکل آئی کہ برائے خدا مجھے تاج نہیں چاہیئے، اس یتیم کا سر سلامت رہنے دو اور سلطنت سے معاف رکھو۔ امیروں نے ہر طرح عہد و پیمان سے اُس کی تشفی کی۔ بعد اس کے خود چتر لگا کر شاہانہ عظمت سے لے گئے اور تاج سر پر رکھ محمد شاہ بادشاہ غازی بنا دیا۔ شہزادہ یا تو قید خانے کی کوٹھڑی میں بند پڑا تھا یا دفعتہً تمام ہندوستان کا شہنشاہ ہو گیا۔ اکبری اور جہانگیری دربار میں سارے امیروں وزیروں کو سامنے ہاتھ باندھے دیکھا۔ آنکھیں کھل گئیں۔ مگر دل میں حیران تھا کہ یہ عجیب بادشاہت ہے۔ محل سے نکلتا ہے تخت پر آ بیٹھتا ہے۔ تخت سے اُٹھتا ہے اندر چلا جاتا ہے۔ معلوم نہیں کہ دربار کیا ہے؟ اور ملک میں کیا ہو رہا ہے؟ ماں کے سوا کوئی اپنا نظر نہیں آتا جس سے دل کا حال کہے اور کچھ مشورہ کرے۔ وزیر اور سپہ سالار دونو دربار کے مالک تھے، جو چاہتے تھے سو کرتے تھے اور انہی کے بھائی بند سارے کاروبار میں پھیلے ہوئے تھے۔ باقی سب امیر برائے نام تھے۔

محمد شاہ تو لڑکا ہی تھا، ماں نے پھر بھی زمانے دیکھے ہوئے تھے وہ سمجھی کہ وزیر اور سپہ سالار کے پنجے سے رہائی ممکن نہیں مگر اتنی بات ہے کہ یہ سید ہیں اور باقی جو دربار کے امیر ہیں اکثر ترک ہیں اور ہر چند وہ بھی بڑے بڑے حوصلے والے ہیں مگر اتفاق وقت سے دب گئے ہیں اور ان دونو فریقوں کا آپس میں بگاڑ ہے بلکہ مذہب میں بھی اختلاف ہے۔ غرض ماں نے بیٹے کو سمجھایا کہ ترکوں سے جوڑ کر سیدوں کو توڑ دو تو بات بن جاتی ہے چنانچہ بادشاہ نے بھی اس بات کا خیال شروع کیا۔ ساتھ ہی زود طالع یہ ہوا کہ وزیر اور سپہ سالار کو بعض کاموں کے لئے

دربار سے دُور ہونا پڑتا تھا۔ کاروبار میں بادشاہ سے گفتگو کرنے کے لئے اور امرا کو بھی رستے ملنے لگے۔ اگرچہ ان دونوں کے معتبر آدمی ہر وقت موجود رہتے تھے، مگر بڑی بات یہ ہوئی کہ محمد شاہ ترکی زبان جانتا تھا۔ چنانچہ ان سے اسی زبان میں باتیں کیا کرتا اور اس پردے میں جو نکتے مطلب کے ہوتے وہ بھی ہو جاتے۔ رقیبوں کے آدمی کھڑے دیکھا کرتے نہ کچھ سمجھتے نہ کہہ سکتے۔

رفتہ رفتہ بادشاہ کی حمایت سے ترکوں نے زور پایا اور ان کے زور سے بادشاہ کی بادشاہت میں زور آیا۔ چنانچہ وزیر اور سپہ سالار مارے گئے اور ان کی قوم کا نام دربار سے مٹ گیا۔ اگرچہ صوبوں میں اب بھی فساد تھے مگر جب دربار غبار سے صاف ہُوا تو بادشاہ کی رنگین طبیعت نے اپنا اصلی رنگ دکھانا شروع کیا۔ چنانچہ ملک کا انتظام امیروں وزیروں پہ چھوڑا اور خود ناچ رنگ، شراب کباب سے ایسا عیش کے دریا میں ڈوبا کہ کسی بات کی خبر نہ رہی۔ رعیت بھی پشتوں سے امن چین کے ساتھ انعام و اکرام سے مالا مال ہوتی چلی آتی تھی گھر گھر عیش و عشرت ہے۔ دن عید رات شب برات ہو گئی۔ ایسی قدردان اور عالی شان سلطنتوں میں علماء، شعراء اور عالم اہل کمال کا کیا ٹھکانا تھا۔ ہزاروں آدمی جمع تھے مگر بادشاہ کی طبیعت کو رنگینی پر مائل دیکھ کر سب رنگین ہو گئے۔ موزوں طبع، لطیفہ گو نوجوان آ کر مصاحبت میں داخل ہو گئے بلکہ پرانے پرانے بڈھے سر سے پاؤں تک خضاب ہو گئے۔ اسی عالم میں بادشاہ خود بھی شعر کہتے تھے۔ چنانچہ فارسی کا شعر ہے ؎

یار دربر صبح بر سر فکر بر جالش کنید ۔۔۔ عاشقاں شب میرود زنجیر در پایش کنید

اور اردو کا شعر ہے ؎

پیری میں نہ کس طرح کروں سیر جہاں کی ۔۔۔ دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشا گزری کا

عمدۃ الملک نواب امیر خاں ایک قدیم الخدمت اور خاندانی امیر زادہ تھا کہ دلیرانہ ہمت اور امیرانہ دماغ رکھتا تھا۔ ساتھ اس کے لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی کا یہ عالم تھا کہ پھلجھڑی کی طرح منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ خلوت و دربار میں ایسی گل افشانیاں کرتا تھا کہ تمام دربار لوٹ لوٹ جاتا تھا۔ لطیفہ۔ ایک دن بادشاہ نے پوچھا کہ امیر خاں یہ جو پوت، سپوت، کپوت، لوگوں کی زبان زد چلے آتے ہیں اب بھی کچھ ان کی اصل ہے؟ عرض کی کہ حضور اسی دربار میں سب موجود ہیں۔ بادشاہ نے کہا کیونکر؟ کہا۔ پوت تو یہی جیسے حضور یعنی سلطان ابن سلطان اور سپوت برہان الملک کہ محمد امین نام ایک مغل ایران سے آیا۔ یہاں حضور کے تصدق سے وہ مرتبہ پایا کہ باپ دادا کا فخر

ہو گیا اور کیوں نہ ہو یہ خانہ زاد کہ باپ دادا حضور کے بزرگوں کی جاں نثاری میں اعلیٰ اعلیٰ عہدوں پر ممتاز رہے اور فدوی اس حالت میں گرفتار ہے۔ **لطیفہ**۔ ایک دن امیر خاں حضور میں اپنے بزرگوں کی جاں نثاریاں اور شاہجہان اور عالمگیر کی قدردانیاں بیان کر رہا تھا۔ اس میں یہ بھی کہا کہ میرا باپ کابل میں ناظم تھا اور اپنی عقل و تدبیر سے اس قدر مورد عنایت تھا کہ کئی مہمیں دکن میں فتح ہوئیں اور عالمگیر نے ان کی فتح اس کے نام پر لکھی۔ یہ ننگ خاندان اس حال میں حضور کے سامنے حاضر ہے۔ برہان الملک نے کہا ؎

پسر نوح با بداں بنشست　　خاندانِ نبوتش گم شد

امیر خاں نے کہا کہ دوسرا شعر بھی تو پڑھیے کہ ؎

سگِ اصحاب کہف روزے چند　　پے نیکاں گرفت و مردم شد

لطیفہ:۔ جب امیر خاں صوبۂ الہ آباد سے آئے تو بادشاہ نے پوچھا کہ امیر خاں ہمارے لئے کیا لائے؟ عرض کی کہ دو ہزار احمق۔ بعد اس کے اپنے باوفا سپاہیوں کو جو وہاں سے ساتھ آئے تھے، موجودات کے لئے حاضر کیا۔ بادشاہ نے جب وہ سجیلے جوان اور ان کی وردیاں اور سامان دیکھے تو بہت خوش ہوئے اور کہا کہ انہی لوگوں کو تم احمق کہتے تھے؟ عرض کی کہ حضور نہ میرے پاس خزانہ۔ نہ ملک، فقط زبانی بات پر تین سو کوس چلے آئے۔ یہ احمق نہیں تو اور کون ہیں۔ بادشاہ نے کہا کہ خیر ان کو اپنی رفاقت میں رکھو۔ تنخواہ حضور سے مجرا ہوا کرے گی۔

غرض ایسے ایسے لوگوں کی صحبتیں تھیں اور عیش و عشرت کے ہجوم تھے۔ مہتاب باغ اور حیات بخش کے باغوں کو سجا کر طلسمات کا نمونہ کر دیا۔ نہروں میں نواڑے پڑے رہتے تھے۔ بادشاہ ان میں بیٹھتے، ناچ رنگ کے جلسے جمتے اور شراب کے دور چلتے۔ جب برسات آتی تو ان کے ہاں بہار آتی۔ قطب صاحب کے جنگل سبزے سے ہرے بھرے ہو جاتے۔ یہ شہر کو چھوڑ کر وہاں جا رہتے۔ حکم تھا کہ ابر سیاہ ہمارا نقیب ہے۔ جب گرجنے کی آواز آیا کرے اسی وقت کمر بندی ہو جایا کرے۔

تمام امرا ایک ایک ملک اور علاقے پر تعینات تھے۔ مگر بہار دربار کے لطف اٹھانے کو نائب اپنے وہاں چھوڑے اور خود دربار میں چلے آئے۔ ظاہر ہے کہ جہاں اہل دربار ایسے ایسے خیالات میں ہوں وہاں ملک کے انتظام کا کیا ٹھکانا مگر تازہ گل یہ کھلا کہ وزیر اور سپہ سالار کے توڑنے کے لئے سب نے تجویز کی کہ نظام الملک آصف جاہ کو دکن سے بلانا چاہیئے۔ چنانچہ وہ آیا۔ کل کاروبار اس کے سپرد ہو گئے اور ہر مقدمہ اس کی صلاح سے طے ہونے لگا مگر

اس ویرینہ سال نے عالمگیر کے عالم دیکھے ہوئے تھے۔ دربار کے رنگ دیکھ کر بہت گھبرایا اور بادشاہ کو صلاحیت پر لانا چاہا۔ یہاں کے رنگین مزاج بھی اس سے گھبرائے اور لپٹے توڑ جوڑ ملانے لگے۔ لیکن چونکہ آصف جاہ ایک رتبے کا شخص تھا، ان کے وار اس کے مقابلے کے قابل تو نہ ہوتے تھے البتہ دق کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دن بادشاہ نے اسے ملبوسِ خاص کا خلعت اور وزارت کا عہدہ دیا۔ اہلِ دربار کو اس بات کا داغ ہوا چنانچہ توڑ اس کا یہ کیا کہ اسی رات کو ناچ کے جلسے میں ایک بھانڈ نے بادشاہ کو بہت خوش کیا، یاروں نے اسے بھی ملبوس خاص کا خلعت دلوا دیا۔ اس پر بھی اس دل شکستہ نے جو طریقے اور آئین بادشاہی درباروں کے ہیں، وہ جاری کرنے شروع کئے۔ خلوت اور جلوت میں بادشاہ کے وقتوں کی تقسیم کی اور کاروبار ملک کے پیش کرنے لگا۔ رنگین مزاجوں نے اس کی ہنسی اڑانی شروع کر دی۔ رنگیلے بادشاہ کو کچھ تو خود یہ کام وبال معلوم ہوتے تھے، کچھ امیروں نے بہکایا۔ چنانچہ آصف جاہ کی عرض و معروض پر بادشاہ کی بھی وہ توجہ نہ رہی۔ ایک امیر نے اپنی جگہ یہ بھی کہا کہ کیسا بندر کی طرح بادشاہ کے سامنے اچھلتا پھرتا ہے۔ آصف جاہ کو بھی دم دم کی خبر لگتی تھی۔ سن کر کہا اگر یہی حال ہے تو فصیل قلعہ کے ایک کنگرے پر بندر ناچے گا۔ آخر تنگ ہو کر کسی بہانے سے اپنے علاقہ پر چلا گیا کہ ایسے مسخروں میں رہ کر وزیر ہندوستان کہلانے سے حیدرآباد کی صوبہ داری بہتر ہے۔ اتفاقاً انہی دنوں میں نادر شاہ افغانوں کو ایران سے نکالتا ہوا قندھار تک آیا اور افغان ادھر سے نکل کر تمام کوہستان کابل میں پھیل گئے تھے۔ چونکہ کابل میں دربار دہلی کی طرف سے صوبہ رہتا تھا، اس لئے نادر شاہ نے محمد شاہ کے پاس اپنا ایلچی بھیجا کہ تم بھی اپنے صوبے کے نام حکم بھیجدو تاکہ دونوں طرف سے دبا کر اس فرقہ کو قرار واقعی گوشمالی دیں۔ یہاں اُن دنوں میں عیش و عشرت کے غل سے آواز تک بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ چنانچہ ایلچی راہ میں مارے گئے اور کسی نے خبر بھی نہ لی۔ کہتے ہیں کہ آصف جاہ خود تو دکن کو گیا تھا۔ مگر نادر شاہ کو خفیہ ایلچی بھیج کر سنکار گیا کہ آپ بے تکلف چلے آئیں۔ یہاں دلی تک میدان صاف ہے۔ چنانچہ چند روز کے بعد نادر شاہ نے ایلچیوں کی تباہی سن کر پھر مراسلہ لکھا اور اخیر کو خطوں کی بے جوابی نے خود اسے بھی ہندوستان کی طرف کھینچا۔ مگر یہاں یہ حال تھا کہ عام خبروں کے علاوہ کابل، لاہور وغیرہ کے حاکموں کی عرضیاں بھی آتی تھیں اور کوئی خبر نہ ہوتا تھا بلکہ جب لوگ نادر شاہ کے آنے کی خبریں دیتے تو امرائے دربار سن کر خفا ہوتے اور کہتے کہ لوگوں کے گھر بہت بلند ہیں۔

دُور سے نادرشاہ کا لشکر دکھائی دیتا ہے۔ جب ناچار ہو کر نادرشاہ نے کابل کو آن گھیرا تو وہاں کے حاکم نے نہایت اضطراب سے عرضی لکھی۔ چنانچہ جس وقت خریطہ پہنچا بادشاہ مہتاب باغ میں عالمِ آب کا تماشا دیکھ رہے تھے اور سامنے ناچ ہو رہا تھا۔ چونکہ اس وقت نہایت سرور کا عالم تھا۔ عرضی کو لے کر گوشہ اس کا شراب میں ڈبویا اور یہ مصرع پڑھا کہ ع ایں دفتر بے معنی غرقِ مئے ناب اولیٰ

چونکہ آصف جاہ کی دانائی اور تجربہ کاری کو اس کے حریف بھی مانتے تھے، اس لئے نادرشاہ کی آمد آمد سن کر اسے بھی دکن سے بلوایا۔ اُدھر نادرشاہ نے کابل کو فتح کر کے پھر نامہ لکھا اور اپنا دوسرا ایلچی جو دربارِ دہلی میں رکا ہوا تھا اسے طلب کیا۔ یہاں دربار میں یہ مقدمہ الجھ رہا تھا کہ کئی خط اور کئی ایلچی آئے اور ادھر سے جواب بھی نہیں گیا۔ اب جواب کیا لکھیں؟ اور لکھیں تو اس میں القاب کیا لکھیں؟ کیونکہ وہ اصل میں نادر قلی ہے کوئی خاندانی بادشاہ نہیں ہے۔ اتنے میں خبر آئی کہ اس کا لشکر اٹک اتر آیا۔ یہاں بھی کوچ کی تیاریاں ہونے لگیں اور چلتے چلتے دو مہینے میں کرنال پہنچے۔ سب نہر کے کنارے برات کی طرح پڑے تھے اور جس طرح لوگ شہر سے عیدگاہ کو جاتے ہیں اس طرح آتے تھے اور لشکر میں شامل ہوتے جاتے تھے۔ برہان الملک کا انتظار ہو رہا تھا کیونکہ اس کی فوج توپ خانہ کی پشت گرمی سے اُن دنوں بہت نامور تھی۔ اتفاقاً جس دن وہ آ کر لشکر میں شامل ہوا اسی دن نادرشاہ بھی پاس پہنچ گیا تھا اور یہاں کسی کو خبر بھی نہ تھی۔ برہان الملک نے دربار کی...... بے پروائی کی شکائتیں کر کے کوچ کی تاکید شروع کی۔

اُسی دن گھسیارے کچھ زخمی کچھ بدحواس دوڑے آئے کہ ہم جنگل میں گھاس کھودنے گئے تھے نادری قراول[1] نے کئی آدمیوں کو گرفتار کر لیا اور ہم نے بھاگ کر اپنے تئیں یہاں پہنچایا ہے۔ امراء نے جمع ہو کر پھر گفتگو شروع کی۔ اتنے میں خبر آئی کہ چند قزلباش نادری برہان الملک کے ڈیروں پر ہاتھ مار گئے۔ برہان الملک تلوار ٹیک کر اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ صاحب اب کونسی بات باقی ہے جس کا انتظار کیا جائے۔ اسی وقت فوج لے کر لڑنے کو روانہ ہوا مگر

---

[1] قراول چند سرداروں کا مجموعہ ہوتا ہے جو فوج سے آگے بڑھ کر کئی کئی کوس تک گرد پڑے مارتا پھرتا ہے تاکہ دشمن کی فوج اور گرد و پیش کے حالات کی خبر رہے اور موقع پاتا ہے تو دست برد بھی کر جاتا ہے۔

خان دوراں نے بادشاہ کو اطلاع دی، انہوں نے آصف جاہ کو خبر کی۔ آصف جاہ بولا کہ پہر دن باقی ہے۔ برہان الملک کو روکنا چاہیئے کیونکہ لشکران کا منزلیں مارتا ہوا آیا ہے اس وقت بے موقع جرأت کرنی مناسب نہیں۔ کل توپ خانہ سامنے رکھ کر اور سب لشکر کو ترتیب دے کر بندوبست سے لڑیں تو مناسب ہے۔ بادشاہ نے یہی بات خان دوراں کو کہلا بھیجی۔ خان دوراں سنتے ہی بگڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ بڑے خیف کی بات ہے ایسا جوانمرد سردار آقا کے نمک پر نثار ہونے جائے اور ہم پہلو میں بیٹھے اس کے مرنے کا تماشا دیکھیں چنانچہ بادشاہ کو کہلا بھیجا کہ برہان الملک اب مقابلے میں جا پڑے ہوں گے۔ اس لئے واپس بلانا مصلحت نہیں۔ ساتھ ہی خود ہاتھی پر بیٹھ فوج کو لے روانہ ہوا اور آدھ کوس کا فاصلہ دے کر برہان الملک کے پہلو میں فوج جما دی۔

نادر شاہ بھی سنتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور فوج کے تین حصے کر کے ایک اپنے ساتھ رکھ دو کو دونوں کے مقابلے میں ڈالا۔ قزلباشوں نے برابر حملے پر حملہ کرنا شروع کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں عیش پروردہ فوجیں پریشان ہو گئیں۔ بہت سے سردار مارے گئے اور خان دوراں زخمی ہو کر میدان سے پھرے۔ یہاں شکست کی ہوا اڑتے ہی خان دوراں کے خیمے ڈیرے لٹ کر سب کارخانوں کی خاک اڑ گئی تھی، اتنا بھی نہ تھا کہ نیم جان لاشے کو سائے میں رکھیں۔ غرض ایک بے چوبہ کہیں سے لے کر اس میں اتارا۔ اتنے میں بادشاہ کی طرف سے سپند خواجہ سرا آئے اور آصف جاہ وغیرہ بھی عیادت کو پہنچے۔ تھوڑی دیر میں اس بے چارے نے ذرا آنکھ کھولی اور آہستہ سے اتنا کہا کہ خیر ہم نے تو اپنا کام کر لیا اب تم جانو اور تمہارا کام جانے۔ مگر اتنا کہتے ہیں کہ بادشاہ کو نادر کے پاس اور نادر کو شہر میں نہ لے جانا جس طرح ہو سکے اس بلا کو یہیں سے ٹال دینا۔

ادھر برہان الملک اور اس کے چند رفیق میدان میں رہ گئے تھے۔ وہ جوانمرد ہاتھی پر بیٹھا تیر مار رہا تھا کہ قزلباش چاروں طرف سے گھر آئے۔ ایک جوان نیشاپوری اس کا ہم وطن گھوڑا اڑا کر پہنچا اور آواز دی کہ اے محمد امین! دیوانہ شدہ۔ بکہ جنگ میکنی و بچہ اعتماد جنگ میکنی؟ برہان الملک نے ہاتھ روک لیا۔ قزلباش نے نیزہ زمین پر گاڑ گھوڑے کی باگ ڈور اس سے باندھی اور جھپٹ کر رسّا پکڑا ہودج کے اندر جا بیٹھا۔ برہان الملک ایران کے دستوروں سے واقف تھا۔ کمان ہاتھ سے رکھ دی اور اپنے تئیں پنجۂ تقدیر کے

حوالے کیا۔ قزلباش ہاتھی کو گھیر کر اپنے لشکر میں لے گئے۔ نادر شاہ نے جرم بخشی کر کے عنایت فرمائی اور چونکہ شام ہو گئی تھی فوج لے کر اپنے خیمہ گاہ کی طرف پھرا برہان الملک کو اپنے ساتھ دستر خوان پر بٹھایا۔ چنانچہ اس نے مصلحت آمیز باتیں کر کے نادر شاہ کو اس بات پر راضی کر لیا کہ حضور ایک معقول نذرانہ لیں اور یہیں سے واپس تشریف لے جائیں۔ نادر شاہ اس بات پر راضی ہو گیا۔ برہان الملک نے ایک عریضے میں یہ سب حال اپنے بادشاہ کو لکھا اور رقعہ آصف جاہ کو بھیجا کہ تم آؤ اور اس امر کا فیصلہ کر دو۔ یہاں سب دریائے حیرت میں غرق بیٹھے تھے کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے! اور حیران تھے کہ کیا کرنا چاہیئے؟ یہ خبر سنتے ہی خوش ہو گئے۔ محمد شاہ نے فوراً آصف جاہ کو روانہ کیا۔ اس نے برہان الملک کے ذریعہ سے نادر کی ملازمت حاصل کی اور بعد گفتگو کے یہ ٹھیرا کہ دو کروڑ روپیہ نعل[1] بہا لیجئے اور یہیں سے تشریف لے جائیے۔ نادر نے یہ بات منظور کی اور آصف جاہ عہد و پیمان کر کے وہاں سے رخصت ہوا۔ مگر محمد شاہ کے سامنے جا کر ان کاموں کو اپنی کارگزاری اور دولت خواہی کے لباس میں ظاہر کیا یعنی برہان الملک کی حسن خدمت کو اڑا دیا۔ حضور سے خان دوران اور امیر الامرائی کا خطاب اور خلعت بیش بہا آصف جاہ کو عنایت ہوا۔ برہان الملک کا ذکر بھی کسی نے نہ کیا۔ دوسرے دن محمد شاہ کی ملاقات کی ٹھیری، بادشاہ ادھر سے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ روانہ ہوئے۔ اُدھر سے نادر نے اپنے بیٹے کو استقبال کے لئے بھیجا۔ وہ رستے میں آ کر ملا۔ بادشاہ نے تخت رواں کو زمین پر رکھوا کر ملاقات کی اس نے فرزندانہ طور سے معانقہ کیا اور ہمرکاب ہو کر نادر شاہ کے پاس لے گیا۔ نادر شاہ لب فرش تک استقبال کو آیا اپنی مسند پر نہایت تعظیم سے بٹھایا بعد اس کے برادرانہ اور دردمندانہ باتیں شروع کیں چاء آئی۔ اس کا دور چلنے لگا۔ نادر شاہ اس وقت برق کی قبا، اس پر قراقلی یعنی سیاہ پوست برہ کا خفتان، اس پر ایک برکی چغہ پہنے بیٹھا تھا۔ سر پر کلاہ پاپاخ[2] تھی۔ ادھر محمد شاہ شبنم کا کرتہ ڈھاکے کی ململ کا جامہ پہنے تھے اور سر پر جو دستار تھی اس سے بھی گھبراتے تھے۔ برابر پنکھا ہوتا تھا۔ نادر شاہ سے کہا کہ رخت شما بسیار گرم ست برتن گرانی نمیکند؟ نادر شاہ نے آہ سرد بھر کر کہا کہ برادر جان من! ہمیں رخت گرم ست کہ مارا از ایران تا باینجا رسانیدہ۔ لطافت

[1] مصارف جنگ اور خرچ راہ کے روپیہ کو نعل بہا یا نعل بندی کا روپیہ کہتے ہیں۔
[2] یہ لمبی ٹوپی بھی پوست برہ یعنی سیاہ دنبے کی کھال کی ہوتی ہے ۱۲

لباس شماست کہ نگزاشت از دہلی تا اینجا حرکت کنید۔ غرض بادشاہ نے ہنسی خوشی یہاں سے مراجعت کی۔ برہان الملک وہاں امیر الامراء کے منصب کو اپنا حق سمجھے بیٹھا تھا۔ اس نے جب آصف جاہ کے خلعت و خطاب کا حال سنا تو بہت بگڑا اور نادر شاہ سے کہا کہ حضور نے کیا غضب کیا جو ہندوستان کے قارونی خزانے چھوڑ کر دو کروڑ روپیہ پر رضامند ہو گئے۔ یہ رقم تو فقط غلام ادا کر سکتا ہے اور بادشاہی خزانے اور امراء اور مہاجنوں کے گھرانوں کے کیا ٹھکانے ہیں البتہ شہر یہاں سے چالیس کوس ہے حضور وہاں تک تکلیف فرمائیں۔

نادر شاہ خوش ہو گیا اور اسی وقت آصف جاہ کو بلا بھیجا۔ وہ خوشی خوشی پھر حاضر ہوا۔ اُسے حکم ملا کہ تم ٹھیرو اور اپنے بادشاہ کو بلا لو۔ آصف جاہ نے کہا کہ عہد نامے میں یہ نہیں ٹھیرا تھا۔ نادر نے کہا کہ ملک و سلطنت اور بادشاہ کی عزت و آبرو سے ہمیں کچھ تعرض نہیں ہم فقط ایک ملاقات اور کرنی چاہتے ہیں۔ آصف جاہ نے ناچار بادشاہ کو لکھا۔ بہت سے امراء اور نوکر چاکر ادھر سے ساتھ چلنے کو تیار ہوئے۔ مگر وہ فقط عمدۃ الملک وغیرہ چند امیروں اور چند خواجہ سراؤں کو لے کر آئے۔ نادر شاہ نے عزت و احترام کے ساتھ الگ خیمے میں اتروا دیا اور کہا کہ بھائی محمد شاہ سلطنت اور دربار کا سامان مع حرم سرا کے منگوا لو اور خاطر جمع سے یہیں رہو۔ لشکر میں بھی حکم بھیج دیا کہ جو چاہے ہمارے لشکر میں آ جائے اور جو چاہے دلی چلا جائے۔ بعد اس کے اپنا فرمان اور بادشاہ کا شقہ ایک اپنے سردار کو دے کر شہر کو روانہ کیا۔ اس نے جاتے ہی قلعہ دار سے کنجیاں لیں اور سب کارخانوں پر قبضہ کر لیا۔ لشکر کے لوگ پریشان ہو کر بھاگے۔ بہتوں کو ولایتیوں نے لوٹ کر باندھ لیا۔ جو ان سے بچے وہ رستے کے گوجروں نے مارے۔ جیتے بچے تو ننگے لچے گھر پہنچے۔ دوسرے دن نادر شاہ بھی شاہ کو لے کر چلے اور دلی میں داخل ہوئے۔ پانچ چار دن کے بعد عید قربان آئی۔ مسجد میں خطبہ نادر شاہ کے نام سے پڑھا گیا اور چونکہ دوسرا دربار تھا اس لئے بڑی دھوم کا تزک و احتشام ہوا۔ مگر قربانی اس عید کی عجیب و غریب ہوئی یعنی عصر کے وقت تک تمام شہر میں امن و امان سے عیش و عشرت ہو رہی تھی جو دفعتہً بھنگر خانے میں بیٹھے بیٹھے ایک بھنگڑ بولا کہ واہ محمد شاہ رنگیلے، آخر بادشاہی پیچ کھیل ہی گیا۔ دوسرا بولا کیا؟ اس نے کہا کہ حرم سرا میں موقع تاک کر ایک قلماقنی[1] سے مغلئے[2] کو مروا دیا۔ یہ ہوا دفعتہً اُٹھی اور ہوا کی طرح تمام شہر میں پھیل گئی

[1] قلماق اگرچہ ترکوں میں ایک فرقے کا نام ہے مگر ہندوستان میں قلماقنی اور اردا بیگنی ان عورتوں کو کہتے تھے جو اسلحہ جنگ سے بھی رہتی تھیں اور حرم سرا میں سپاہیوں کی طرح پہرے وغیرہ کا کام کرتی تھیں ۱۲ [2] یعنی نادر شاہ کو مروا ڈالا ۱۲

غضب یہ ہوا کہ نادری سپاہی جو ایک ایک دو دو گلی کوچوں میں بے تکلف پھرتے تھے انہیں لوگوں نے بے وارثا سمجھ کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ رات کو نادر کو خبر پہنچی۔ اس نے فوج کو حکم دیا کہ اپنی جگہ پر قائم رہو اگر تم پر چڑھ کر آئیں تو جواب دو نہیں تو چپ چاپ بیٹھے رہو۔ رات بھر برابر تلوار چلتی رہی اور صبح تک سات سو ولایتی شہر میں کٹ گیا۔ افسوس یہ کہ ارکانِ دربار چپکے تماشا دیکھا کئے بلکہ چند اشخاص کہ جن کو نادر شاہ سے کہہ کر اپنے گھر لے گئے تھے وہ بھی مارے گئے۔ نادر نے صبح اٹھ کر پوچھا تو وہی حال سنا۔ حیران ہوا کہ کرنال کے معرکۂ جنگ میں کل تین ولایتی مرے اور بیس آدمی زخمی ہوں! اور شہر میں میرا صدہا سپاہی اس طرح ضائع ہو جائے! دنیا آنکھوں میں اندھیر معلوم ہونے لگی۔ اسی وقت نکلا اور گھوڑے پر سوار ہو کر شہر کو دیکھتا ہوا چلا کہ شاید مجھے زندہ و سلامت دیکھ کر یہ طوفان ختم ہو جائے اور دہلی کے قتلِ عام کا دھبہ میرے نام پر نہ آئے۔ مگر شہر کے لوگوں نے اس پر بھی پتھر پھینکنے شروع کر دیئے بلکہ بندوقیں بھی ماریں۔ یہاں تک کہ ایک مصاحب کا پہلو زخمی ہوا۔ ساتھ ہی دیکھا کہ جا بجا ایرانی غریب الوطنوں کے لاشے پڑے ہیں۔ یہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اور قتلِ عام کا حکم دے کر کہہ دیا کہ جہاں تک کوئی ذی نفس مرا ہوا نظر آئے ایک آدمی جیتا نہ رہے۔ یہ کہہ کر ترپولیے تک آیا اور روشن الدولہ کی مسجد میں آکر قتلِ عام کی علامت ظاہر کی یعنی تلوار کھینچ کر مسجد میں بیٹھ گیا۔ کوچوں میں خون کے نالے بہہ گئے اور گھروں میں آگ لگ کر زمین سے آسمان تک دھواں دھار ہو گیا۔ نادر شاہ کا غصہ خدا کا قہر۔ بادشاہ اور امیر سب دبکے بیٹھے اور دم نہ مار سکتے تھے۔ ایک بڈھا خواجہ سرا محمد شاہ کے پاس روتا ہوا آیا اور کہا کہ حضور کے باپ دادا کی رعیت سب قتل ہو گئی۔ بادشاہ بھی آبدیدہ ہوئے اور اتنا کہا کہ ؎

دیدۂ عبرت گشا قدرتِ حق را ببیں
شامتِ اعمالِ ما صورتِ نادر گرفت

دوپہر کے قریب جب عالم میں کہرام مچ گیا تو پھر سب نے آصف جاہ سے رجوع کی۔ وہ تلوار گلے میں ڈالے سر برہنہ گئے، خاموش نادر کے سامنے جا کھڑا ہوا اور رونے لگا۔ نادر شاہ کے دل میں بھی خدا نے رحم ڈالا پوچھا کہ چہ میخواہی؟ اس نے یہ شعر پڑھا ؎

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغِ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی را و باز کشی

ۃ یعنی سنہری مسجد۔

نادر نے شرما کر سر جھکا لیا، تلوار میان میں کی اور کہا کہ بریشِ سفیدت بخشیدم۔ اسی وقت شہر میں ایرانی نقیب اور چاؤش امان امان کہتے ہوئے دوڑے اور پل کے پل میں امن ہو گیا۔۔۔ سلطنت کے کاروبار کے ساتھ دونوں بادشاہوں کی صحبتیں پھر بدستور جاری ہو گئیں۔ ایک دن بادشاہ نے نادر کی دعوت کی۔ ایک ایک خدمت ایک ایک امیر کے سپرد ہوئی۔ کھانے کے بعد جب چائے آئی تو عمدۃ الملک نے پیالی چائے کی بھری مگر جب دینے لگا تو سوچا کہ اگر پہلے اپنے آقا کو دوں تو ادھر نادر ہے ایسا نہ ہو ابھی سر اڑا دے اور اگر نادر کو پہلے دوں تو آیندہ بھی اپنے دربار میں منہ دکھانا ہے۔ یہاں اس کی تیزی طبع کا جوہر کام آیا یعنی محمد شاہ کے سامنے پیالی کر کے کہا کہ شاہاں بشاہاں مید ہند۔ یعنی فدوی کی لیاقت نہیں کہ اس عالی جاہ بادشاہ کو چائے دے۔ آپ اپنے دستِ مبارک سے دیجئے۔ چنانچہ دونوں بادشاہ خوش ہوئے اور دونوں کے اہل دربار نے اس اندازِ خوشنما پر تحسین و آفریں کی

لطیفہ۔ ایک دن نادر شاہ کو پیٹ میں گرانی معلوم ہوئی۔ محمد شاہ سے حال بیان کیا۔ اسی وقت علوی خاں حکیم آیا اور نبض دیکھ کر دواخانے کے داروغہ کو اشارہ کیا۔ چنانچہ کشتی مرصع پر زرنگار خوان پوش پڑا ہوا آیا۔ خوان پوش اٹھایا تو ایک مرصع مرتبان میں گلقند، الماس کا چمچہ برابر دھرا، گنگا جمنی کانٹا رتی ماشے سمیت وزن کے اندازے کے لیے ساتھ موجود تھا۔ اور حکیم سوچتا تھا کہ کس قدر گلقند اس میں سے نکالے اور وزن کر کے کھانے کو دے۔ نادر شاہ نے خود مرتبان کو اٹھا لیا اور کھول کر دیکھا۔ بعد اس کے دو انگلیاں اندر ڈال کر چار نوالوں میں مرتبان خالی کر دیا۔ چونکہ اس میں خوشبودار دوائیں بھی ملی ہوئی تھیں اچھا معلوم ہوا اور کہا کہ — حلوائے خوبست دیگر بیارید۔

لطیفہ۔ ایک دن نادر شاہ ہوا کھانے کو سوار ہوا۔ محمد شاہ نے کہا کہ ایران میں ہاتھی نہیں ہوتا۔ آج انہیں ہاتھی پر سوار کرو۔ جب ہودج میں جا کر بیٹھا تو آگے فیل بان کو دیکھا پوچھا ایں کیست۔ لوگوں نے کہا۔ فیل بانست، ایں را میراند۔ فیلبان سے کہا کہ عنانش بمن بدہ اس نے عرض کی کہ قبلۂ عالم فیل عنان ندارد باشارۂ سر پایم راہ میرود۔ ناک چڑھا کر بولا۔ بنشانید کہ فرود آیم[1] مرکبے کہ عنانش بدست غیر باشد سواری را نشاید۔

---

[1] فرود آیم کا مخفف ہے یعنی ہاتھی کو بٹھا دو کہ ہم اتر آئیں ۱۲

لطیفہ۔ محمد شاہ کے اہل نشاط میں ایک کنچنی تھی نور بائی اُس کا نام تھا اور ناچ گانے کے علاوہ حاضر جوابی اور لطیفہ گوئی کا یہ عالم تھا کہ گویا منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ ایک دن نادر شاہ نے بھی اُس کا گانا سنا۔ چنانچہ بہت محظوظ ہوئے کچھ انعام دیا اور کہا کہ نور بائی روئے ہند را سیاہ کن بیا کہ بہ ایران بریم۔ یہ سنتے ہی بائی جی کا دم بند ہوگیا اور ساری لطیفہ گوئیاں بھول گئیں۔ دل میں ڈریں کہ خوش ہو کر ساتھ لے چلا ہے۔ اگر ذرا خفا ہوا تو خدا جانے ناک کاٹ دے، آنکھ نکال لے، پیٹ چاک کر ڈالے۔ غرض اسی وقت یہ غزل گائی ؎

من شمعِ جاں گدازم تو صبحِ دلکشائی
سوزم گرت نہ بینم میرم چو رُخ نمائی
نزدیکت ایں چنینم دُور آنچناں کہ گفتم
نے تابِ وصل دارم نے طاقتِ جدائی

نادر شاہ بہت خوش ہوا اور اس کا مطلب سمجھ کر اپنے ارادے سے در گذرا۔

اسی عرصے میں نصر اللہ میرزا اپنے بیٹے کی ایک شاہزادی سے شادی کی، دو مہینے وہاں رہ کر خاطر خواہ نقد و جنس اور جواہر جس قدر سمیٹ سکا یہاں تک کہ تخت طاؤس کو بھی اٹھا لیا اور سونے چاندی کے چچی کے پاٹ ڈھلوا کر اونٹوں پر لدوا دیئے۔ غرض کُل تیس کروڑ روپیہ کا اثاثہ لے کر روانہ ہوا۔ اور ڈیرہ جات کابل اور پنجاب کے ان علاقوں کو جن کا روپیہ کابل کی فوج میں لگا ہوا تھا انہیں ہندوستان سے نکال کر ایران کی سلطنت میں داخل کیا۔ محمد شاہ دوبارہ پھر یہاں رنگ رلیاں کرنے لگے اور چند سال کے بعد اسی عیش و عشرت سے ۳۰ برس سلطنت کر کے عالمِ بقا کو روانہ ہوئے۔

بابا نانک صاحب

سکھوں کا فرقہ اگرچہ بابر بادشاہ کے عہد سے پیدا ہوا مگر مدتِ دراز تک یہ لوگ فقیرانہ وضع اور صلح کُل کے لباس میں نشوونما پاتے رہے۔ عالمگیر کے عہد میں وضع ان کی بدلنی شروع ہوئی یہاں تک کہ فرخ سیر اور محمد شاہ کے عہد میں ملک گیری کے ہاتھ پاؤں نکال کر تلوار سنبھالی۔ چونکہ اصل بانی اس فرقے کے گرو نانک صاحب تھے اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ ان کا حال بھی اس کتاب میں درج کیا جائے۔

تلونڈی گاؤں میں کالو نام ایک کھتری تھا کہ حساب کتاب گاؤں کا لکھا کرتا تھا۔ اس کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوا کالو بہت خوش ہوا اور لڑکے کا نام نانک رکھا۔ اس کی دائی کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ جس وقت وہ پیدا ہوا تو ایسا غل اور شور معلوم ہوا جیسے کسی بڑے امیر وزیر کی سواری کی آمد آمد میں ہوتا ہے۔ غرض جب لڑکا بڑا ہوا تو اسے فارسی زبان اور رسمی حساب کتاب سکھانا شروع کیا۔ اس نے بہت جلد سیکھ لیا لیکن باوجود اس کے دنیاوی کاروبار کی طرف اس کی طبیعت اصلا راغب نہ تھی۔

کالو چاہتا تھا کہ بیٹے کو بنج بیوپار کے کام میں لگائے۔ چنانچہ اسی خیال سے ایک دن اسے بلایا اور چالیس روپے دے کر ایک جاٹ کے ساتھ کسی گاؤں کی طرف روانہ کیا۔ رستے میں اسے چند فقیر ملے۔ نانک نے انہیں کھانے پینے سے محتاج دیکھ کر افسوس کیا اور کچھ روپے دینے چاہے۔ ان لوگوں نے کہا بابا نقدی ہمارے کس کام کی ہم تو بھوکے ہیں کچھ کھانے کو دے۔ نانک خود شہر میں گیا اور چالیس روپے کا آٹا لا کر روٹیاں پکوائیں اور سب فقیروں کو کھلائیں۔ جب اس خیرات سے فارغ ہوا تو گھر کو پھرا۔ گھر کے پاس ایک درخت تھا۔ باپ کے ڈر سے جا کر اس کی ٹہنیوں میں چھپ رہا۔ باپ کو سب خبر ہوئی تو ڈھونڈ کر نکالا اور پوچھا کہ تو کیونکر واپس آیا اور جو روپے میں نے دیئے تھے وہ کیا کیئے۔ اس نے سب حال بیان کیا اور کہا کہ تم نے روپے نفع کمانے کو دیئے تھے سو میں نے آخرت کا نفع کما لیا۔ کالو کو کیا خبر تھی کہ یہ خدا پرست لڑکا

ایک موحد کامل ہو کر دنیا کے غافلوں کو آخرت کے نفع کا رستہ بتائے گا۔ بیٹے کی تقریر سن کر بہت خفا ہوا اور نصیحتاً مارنے کو تیار ہوا۔ اتفاقاً ایک زمیندار مسلمان وہاں آنکلا اس نے پہلے بھی کچھ کچھ حالات نانک کے سنے ہوئے تھے۔ چنانچہ کالو کو روکا اور اسے چھڑا لیا۔ آخر باپ کو جب معلوم ہوا کہ اس کی طبیعت دنیا کے کاموں کے ڈھب کی بالکل نہیں تو اسے بڑا رنج ہوا۔ چنانچہ اکثر اس پر غصے ہوا کرتا مگر ماں اس کی محبتِ مادری سے باپ کے غصے کو ٹھنڈا کیا کرتی تھی۔ ناچار ہو کر سلطان پور علاقہ کپورتھلہ میں اس کی بہن بیاہی ہوئی تھی وہاں بھیج دیا۔ وہاں کا نواب دولت خاں ذات کا پٹھان ابراہیم لودھی بادشاہ دہلی کا رشتہ دار تھا اور نانک کا بہنوئی اس کی سرکار میں نوکر تھا۔ اس نے نانک کو وہاں پہنچایا۔ چنانچہ وہ بابا نانک جنہیں فقیر کی گدی پر بیٹھ کر راج کرنا تھا چند روز کے لئے مودھی بن کر بیٹھ گئے۔ اب ان کی سخاوت نے دل کی آرزو نکالنے کے لئے اس سے بہتر موقع نہ پایا۔ دان پُن کا دروازہ کھول کر رات دن سدابرت جاری کر دیا۔ انجام اس کا یہ ہوا کہ چند روز میں ان پر غبن کا الزام لگا اور محاسبہ طلب ہوا لیکن جو شخص خدا کی راہ میں صرف کرے اس کے حساب میں کمی کب آتی ہے۔ ! جب حساب ہوا تو ان کا کچھ روپیہ نواب کے ذمہ فاضل نکلا۔

ان ہی دنوں میں ان کی شادی علاقہ بٹالہ میں ایک کھتری کے گھر ہو گئی تھی۔ اگرچہ انہیں دنیاداروں کی طرح خانہ داری اور گھر بار بسانے کا شوق نہ تھا مگر چونکہ خدا کو نسل بڑھانی تھی، اسی حال میں سری چند اور لکھمی داس دو بیٹے بھی ہو گئے مگر بابا نانک کے دل پر نقش تھا کہ دنیا نقش بر آب ہے اور زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں اس لئے ہمیشہ سیاحی میں رہتے اور سفر کے پردے میں ترکِ دنیا کر کے یادِ الٰہی کے لطف اٹھاتے اور چونکہ بنیاد عقیدے کی توحید کے ساتھ صلح کل پر تھی، اس لئے باتیں ایسی دل نشین اور خاطر پسند تھیں کہ سب سن سن کر خوش ہوتے تھے اور ہر مذہب کے لوگ نظرِ عظمت سے دیکھ کر صحبت کو غنیمت سمجھتے تھے۔ اسی حال میں فقیرانہ ریاضتیں بھی کیں۔ چنانچہ ایک دفعہ سلطان پور کے پاس بیاس دریا میں[1] تین دن رات برابر پانی میں کھڑے رہے اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر بھگوان کی تپسیا کرتے رہے۔ غرض اسی طرح رفتہ رفتہ بالکل دنیا سے قطع

[1] اب بھی سکھ اس مقام کو متبرک سمجھ کر اشنان کرتے ہیں اور اس کا نام سنت گھاٹ رکھا ہے سکھ اسے بابا کی بیری کہتے ہیں ۱۲

تعلق ہوگیا اور گھر بار سب چھوٹ گیا۔ جب یہ حال ان کے سسر نے دیکھا تو بہت رنج ہوا چنانچہ وہ نواب دولت خاں کے پاس آیا اور اس سے کہہ سنکر بابا نانک کو بلوایا۔ مگر وہ ایسے اپنی دُھن کے پکے ہو گئے تھے کہ ہر چند نواب کے آدمی گئے وہ باتوں ہی میں ٹالتے رہے۔ نواب کے دربار تک بھی نہ آئے۔

کہتے ہیں کہ ایک دن بابا نانک کو نواب اپنے ساتھ مسجد میں لے گئے۔ نواب تو نماز میں مصروف ہوئے، بابا نانک الگ بیٹھے رہے۔ جب نواب نماز سے فارغ ہوا تو پوچھا کہ نانک تم خدا کی نماز میں ہمارے ساتھ شریک نہ ہوئے۔ نانک نے کہا تمہارا دل تو قندھار میں گھوڑوں کی خریداری کر رہا تھا، نماز کس کے ساتھ پڑھتا۔ نواب بھی منصف آدمی تھا اس نے صاف کہدیا کہ فی الواقع میرا خیال ٹھکانے نہ تھا۔

ایک دن قاضی جی نے انہیں بلا کر نماز کے لئے مجبور کیا اور جب نماز سے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ یہ الگ کھڑے رہے۔ نماز نہیں پڑھی۔ قاضی جی بہت خفا ہوئے اور کہا کہ بابا تو نے نماز کیوں نہیں پڑھی؟ انہوں نے ہنس کر کہا کہ قاضی جی آپ لوگوں میں کھڑے ہوئے نماز پڑھتے ہیں اور دل میں کبھی یہ خیال ہے کہ بیٹا بیمار ہے۔ کبھی یہ فکر ہے کہ بچھڑا کھلا چھوڑ آیا ہوں، وہ کوئیں میں نہ گر پڑا ہو۔ سن کر قاضی جی خاموش ہو گئے۔

غرض بابا نانک نے بالکل دنیا سے کنارہ کر کے فقیری اختیار کی۔ جورو بچے ان کے باپ کے گھر جا رہے اور یہ ملک بہ ملک دیس بدیس پھرنے لگے۔ خدا کی یاد کیا کرتے اور آنکھیں بند کئے دل کے دروازے کھولے بیٹھے رہتے۔ اس عالم میں دو آدمی ان کے رفیق تھے۔ ایک تو بالا نام شخص تھا کہ بچپن سے ان کے ساتھ تھا یہ ہندو دھرم تھا اور دوسرا مردانہ نام ایک مسلمان تھا کہ ذات کا ڈوم تھا۔ جب بابا نانک یادِ الٰہی میں بیٹھتے تھے تو مردانہ رباب بجا کر اور تصوّف اور معرفت کے بھجن گا کر دل روشن کیا کرتا۔ مردانہ بھی عجیب ہشیار و دانا تھا ان کی رفاقت میں بھوکوں مرتا۔ جورو بچوں کو یاد کر کے تڑپتا اور اکثر بلاؤں میں بھی مبتلا رہتا۔ ظاہر میں بہت گھبراتا مگر ان کا ساتھ نہ چھوڑتا اور گرو نانک اور بھائی بالا کو اپنی باتوں سے خوش کر کے دل بہلایا کرتا۔ بابا نانک اپنی سیاحی کے عالم میں ایمن[1] آباد میں

---

[1] یہاں جس ویرانے میں گرو نانک صاحب ٹھیرے تھے وہاں ادھر ادھر سے لیکر پتھر برابر چن لئے کہ زمین ہموار ہو جائے چنانچہ اس جگہ کو سکھو روڑی کہتے ہیں ۱۲

بھی چند روز آکر رہے۔ یہاں بھی ان کی خدا پرستی اور صفائیِ دل نے بہت سے معتقد جمع کر لیے۔ اتفاقاً انہی دنوں میں بابر بادشاہ بھی ہندوستان میں آیا جب اس کے لشکر کا گزر ایمن آباد میں ہوا تو شہر خوب لٹا اور گورو نانک مع اپنے معتقدوں کے بیگار میں پکڑے گئے۔ اس عالم میں بھی ان کے موحدانہ کلاموں نے اپنے نور کا جلوہ دکھایا۔ یعنی سپاہیوں کو جب حال معلوم ہوا تو بادشاہ مذکور کے سامنے لے گئے۔ بابر اُن سے اچھی طرح پیش آیا اور ان کی باتیں سن کر بہت محظوظ ہوا۔ کہتے ہیں کہ اس وقت بابر بادشاہ اپنے مصاحبانِ خاص کے ساتھ بیٹھا تھا اور شراب کا دور چل رہا تھا۔ شاہ مذکور نے کہا کہ بابا کو بھی شراب دو۔ بابا نانک نے کہا کہ اس کا نشہ عارضی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اتر جاتا ہے۔ مجھے ایک ایسا نشہ ہاتھ آگیا ہے کہ کبھی اُترتا نہیں۔ مجھے اس سے معاف رکھئے۔ بابر اس لطیفے کو سن کر بہت خوش ہوا۔ کہتے ہیں کہ اسے بابا نانک نے دعا بھی دی تھی اور کہا تھا کہ سات پُشت تک تیری اولاد کی بادشاہت اس ملک میں قائم رہے گی۔

جب اسی طرح پھرتے پھرتے دنیا کے سفر کی مدت تمام ہوئی اور سفر آخری کا وقت آیا تو ضلع گورداسپور میں ایک مقام پر آئے۔ وہاں ایک دھرم سالہ بنوایا اور اس کا نام کرتارپور رکھا۔ یہاں بیٹھ کر اپنے بال بچوں کو بھی بلوایا اور جو چیلے جابجا تھے انہیں بھی جمع کیا۔ چند روز ان لوگوں کو اپنے پند و نصائح سے فیض بخشی کی تھی کہ پیغام اجل کا آیا اور ستر برس کی عمر میں دنیا سے انتقال کیا۔

بابا نانک کی خداشناسی اور وحدت پرستی کی باتیں جو خاص و عام میں زبان زد ہیں، نہایت دلچسپ اور پُر تاثیر ہیں۔ ایک دفعہ بابا نانک ہردوار کے میلے میں پھر رہے تھے۔ چند برہمنوں کو دیکھا کہ اپنی رسم مذہبی کے بموجب مشرق کو منہ کئے درختوں کو پانی دے رہے ہیں کہ پتروں کو اس کا ثواب پہنچے۔ باباجی ان کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور مغرب کو منہ کر کے اسی طرح پانی اچھالنے لگے۔ وہ لوگ انہیں پہچانتے نہ تھے، سمجھے کہ یہ کوئی گنوار فقیر پوجا پاٹ کے طریقہ سے بالکل بے خبر ہے چنانچہ ہنس کر کہا کہ بابا یہ کیا کرتا ہے؟ انہوں نے کہا کہ کرتارپور میں میرے کھیت ہیں انہیں پانی دیتا ہوں۔ انہوں نے کہا بھلا یہ کیا عقل ہے؟ یہاں سے وہاں تک صدہا کوس کا فاصلہ ہے، یہ پانی اتنی دور کیونکر پہنچ سکتا ہے؟ باباجی نے ہنس کر کہا کہ اگر اتنی دور بھی پانی نہیں پہنچ سکتا تو بھلا کیونکر تم کو امید ہے کہ

یہ چار چلو پانی جو یہاں چھڑک رہے ہو دوسری دنیا میں تمہارے پتروں کو پہنچ جائے گا۔ بعد اس کے چند دہرے معرفت الٰہی کے لبلبے پڑھے کہ تمام سننے والوں کے دل پانی پانی ہو گئے اور سب نے آ کر قدم لئے۔

باباصاحب کے معتقد ان کی سیاحی اور صفائے باطنی کی باتیں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ جو لوگ تاریخ اور علومِ ظاہری کے پابند ہیں انہیں سُن کر حیران رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کا بیان ہے کہ وہ اکثر عالم ہوا میں پرواز کرتے تھے اور جس مقام پر چاہتے تھے دم کے دم میں جا پہنچتے تھے بلکہ جس مقام کو چاہتے تھے اپنے پاس بلا لیتے تھے۔ یہاں تک کہ عربستان کی بھی سیر کی اور مکہ میں بھی گئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ گرو صاحب ایک دن حرم کعبہ کی طرف پاؤں کر کے سو رہے۔ وہاں کے لوگوں نے جب یہ حال دیکھا تو بہت غصے ہوئے اور انہیں جگا کر لعنت ملامت کرنے لگے۔ انہوں نے کہا کہ ایسا کیا گناہ مجھ سے ہوا جو تم اتنا خفا ہوتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ اے بے عقل بابا تو خدا کے گھر کی طرف پاؤں کر کے سوتا ہے اور پھر پوچھتا ہے کہ گناہ کیا ہوا؟ انہوں نے کہا کہ میں تو جدھر خیال کرتا ہوں خدا ہی کا گھر معلوم ہوتا ہے۔ تمہارے نزدیک جدھر خدا کا گھر نہ ہو اُدھر میرے پاؤں کر دو۔ یہ نکتہ سُن کر وہ خاموش ہو گئے۔

اِس حق شناس نے اپنی اولاد میں سے کسی کو گدی پر نہ بٹھایا۔ بلکہ اپنے چیلوں میں سے میاں لہنا کھتری کو اپنا جانشین کیا اور ان کا نام انگد گرو رکھا، یعنی ذات ایک اور جسم و جان ایک۔ ان کی بی بی نے جب یہ حال دیکھا تو انہیں بہت رنج ہوا۔ اور آخر کو اصرار کر کے کہا کہ اپنے فرزندوں کے ہوتے غیر شخص کو جانشین کرنے سے کیا حاصل ہے؟ جو کچھ تم کہتے ہو یہ تمہاری اطاعت کریں گے۔ اتفاقاً ان ہی دنوں میں ایک دفعہ فرش پر چوہا نیم جان پڑا تھا۔ انہوں نے بیٹوں سے کہا کہ اسے اٹھا کر پھینک دو۔ بیٹوں میں سے کسی نے اسے ہاتھ نہ لگایا۔ گرو صاحب نے لہنا کو اشارہ کیا اس نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور چوہے کو اٹھا کر پھینک دیا۔ گرو صاحب بہت خوش ہوئے اور اسے دعائیں دیں بلکہ یہ بھی فرمایا کہ میرا اصلی بیٹا یہی ہے جس نے میرے حکم کی تعمیل کی۔ اسی طرح ایک دن کا ذکر ہے کہ جنگل میں چلے جاتے تھے دیکھا کہ ایک مُردار لاشہ پڑا ہے۔ باباجی نے کہا کہ جو میرا صدقِ دل سے چیلا ہے وہ اس مُردار کو کھائے۔ چنانچہ اور سب کو نفرت آئی مگر میاں لہنا اسی وقت جھک کر منہ مارنے

لگے۔ پھر دیکھا تو وہ صرف موہن بھوگ یعنی تر حلوا تھا لاشہ مردار کچھ نہ تھا۔

چونکہ بابا نانک کے خیالات توحیدِ مطلق کے نور سے نورانی اور صلح کل کے عطر سے معطر تھے، اس لئے ہندو مسلمان ہر مذہب کے لوگ ان کے ساتھ محبت اور اعتقاد رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کی نعش پر آ کر جھگڑا ہوا یعنی مسلمان کہتے تھے کہ ہم بموجب مذہبِ اسلام کے تجہیز و تکفین کریں گے اور نماز جنازہ پڑھ کر دفن کریں گے۔ ہندو کہتے تھے کہ ہم کریا کرم کر کے جلائیں گے۔ اس تکرار نے ایسا طول کھینچا کہ لڑائی تک نوبت پہنچی۔ لیکن جب نعش پر سے چادر اٹھائی تو وہاں کچھ[1] بھی نہ تھا۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ آدھی چادر ہندوؤں نے لے کر جلائی اور آدھی مسلمانوں نے لے کر قبر میں دفن کر دی۔ مگر زمانے کی گردش ان سب پر غالب ہے۔ چونکہ مقام مذکور دریائے راوی کے کنارے پر تھا اس لئے پانی کی طغیانی قبر اور سمادھ دونوں کو بہا کر لے گئی۔

گورو نانک کے بعد گورو انگد تیرہ برس اپنے چیلوں کو ہدایت کر کے فوت ہوئے۔ وہ لاولد تھے۔ گرو امر داس اپنے چیلے کو گدی سپرد کر گئے۔ بائیس برس کے بعد وہ بھی مر گئے۔ انہوں نے باوجود اولاد کے گرو رام داس اپنے داماد کو گدی سپرد کی۔ وہ سات برس کے بعد مر گئے اور گرو ارجن ان کے بیٹے جانشین ہوئے۔ پچیس برس کے بعد وہ بھی مر گئے اور گرو ہرگوبند ان کے بیٹے جانشین ہوئے۔ اڑتیس برس کے بعد انہوں نے بھی قضا کی اور گرو ہر رائے ان کے پوتے قائم ہوئے۔ سترہ برس اپنے مریدوں کو رہنمائی کر کے ان کا بھی انتقال ہوا۔ چیلوں نے ان کے بعد گرو ہرکشن کو کہ نہایت خورد سال تھے گدی پر بٹھایا مگر وہ تین برس کے بعد مر گئے۔ ان کے بعد گرو تیغ بہادر چھوٹے بیٹے گرو ہرگوبند گدی پر بیٹھے۔ مگر چونکہ انہوں نے جمعیت بہت سی بہم پہنچائی تھی اور عالمگیر کا عہد تھا، بادشاہ مذکور نے انہیں قید کیا اور مروا ڈالا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے گرو گوبند مسند نشین ہوئے۔ لیکن چونکہ گرو تیغ بہادر نے معتقد بہت پیدا کر لئے تھے۔ اس کے علاوہ گرو گوبند کے دل میں خیالات ملک گیری کے سمائے ہوئے تھے اور دلی کی سلطنت نہایت ضعف پر تھی۔ انہوں نے بڑا اقتدار بہم پہنچایا۔ ہزاروں سکھوں کی فوج پیادہ اور سوار ان کی رکاب میں رہنے لگی اور بادشاہی لشکر سے بھی مقابلے ہونے لگے۔ ان کے بعد گرو گوبندا جی جانشین ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے گرو تیغ بہادر اور گرو گوبند کے خیالات کو زیادہ تقویت دی اور بادشاہی صوبوں کو بھی نہایت تنگ کیا۔ یہ محمد شاہ کا زمانہ تھا دربار سے لاہور اور کشمیر کے صوبوں کو حکم پہنچا اور اکثر مقاموں پر لڑائیاں ہوئیں مگر انجام یہ ہوا کہ گرو بندا جی بہت سے ہمراہیوں کے ساتھ قید ہو کر دلی گئے اور وہاں سب کے سب مارے گئے۔ یہ تینوں گرو اپنے معتقدوں کے دلوں میں ایسا جوش و خروش پیدا کر گئے کہ وہ فرقہ جس کی بنیاد فقط فقر اور صلح کل پر رکھی گئی تھی، ایک بہادر ملک گیر گروہ ہو گیا اور ایک دن وہ ہوا کہ کل ملک پنجاب سالہا سال کے لئے اس فرقے کے قبض و تسلط میں آگیا۔ فقط

تمت

---

[1] قیاساً معلوم ہوتا ہے کہ کوئی گرو کا خالصہ نکال لے گیا۔ ۱۲